صبح کی مانند تیرا نام
ڈاکٹر عالیہ امام

صبح کی مانند تیرا نام

ڈاکٹر عالیہ امام

پہلا ایڈیشن : ایک ہزار

قیمت : ۹۵ روپے

بیرون ملک : ۱۵۰ روپے

سرورق : بلال احمد ایوبی

کمپوزر : غلام حیدر

تصاویر : سیدہ ساجدہ تقی

ناشر : شوکت آرٹ پریس راولپنڈی

طباعت : شوکت آرٹ پریس، راولپنڈی

کتاب ملنے کا پتہ : ۳۳۵، سوان روڈ، G-10/4

اسلام آباد۔ فون نمبر 850564

عرض ناشر

ہمارے ادارے نے علمی و ادبی موضوعات پر اب تک جتنی کتابیں شائع کی ہیں وہ نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ اردو زبان کی بہترین کتابوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آج ہمارا ادارہ بر صغیر کی ممتاز دانشور و ادیبہ ڈاکٹر عالیہ امام کی تصنیف ''صبح کی مانند ترانام'' پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ ادبی اور سیاسی دنیا میں تخلیقی رکھ رکھاؤ اور حکیمانہ بصیرت کی علامت ہیں۔ زندگی کی طرح ادب میں بھی وہ جانبداری کی قائل ہیں۔ ''مشاہدہ،، ہی نہیں ''مجاہدہ،، بھی ان کی بزرگی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ معلم، سیاست داں، مقرر اور ادیب۔ معلم کی حیثیت سے پاکستان میں ''آدم جی سائنس کالج'' اور ''پریمیر کالج'' کے علاوہ پیکنگ یونیورسٹی (چین) -lan guage institute (روس) اور اصفہان میں درس و تدریس سے متعلق رہیں۔

سیاست دان کی حیثیت سے پاکستان میں ہمیشہ آمریت کے خلاف جہاد کیا جس کے نتیجے میں ۲۴ گھنٹے کے اندر ملک بدر ہوئیں۔ نیشنل عوامی

پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی ممبر منتخب ہوئیں۔ ضیاء کے خلاف تحریک میں پیش پیش رہیں۔ بھٹو صاحب کے قید کے دوران پیپلز پارٹی میں شامل ہوئیں اور پولٹیکل و کلچرل ایڈوائزر بنیں۔

مقرر کی حیثیت سے یورپ، سوئٹزلینڈ، سینٹرل یورپ، بلغاریہ، رومانیہ، سینٹرل ایشیا کے مختلف علاقوں کی امن کانفرنس "peace" اور ادبی کانفرنسوں میں فیض احمد فیض اور دیگر اکابرین کے ہمراہ شرکت کی۔ ادیبہ کی حیثیت سے کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ جن میں سے کئی بہت اہم ہیں۔

(۱) "Contribution of Hazrat Ameer Khusro to the Musie of the subcontinent"

(۲) "Democracy in Pakistan"

(۳) ''شاعرانقلاب
تنقیدی و نظریاتی مطالعہ''
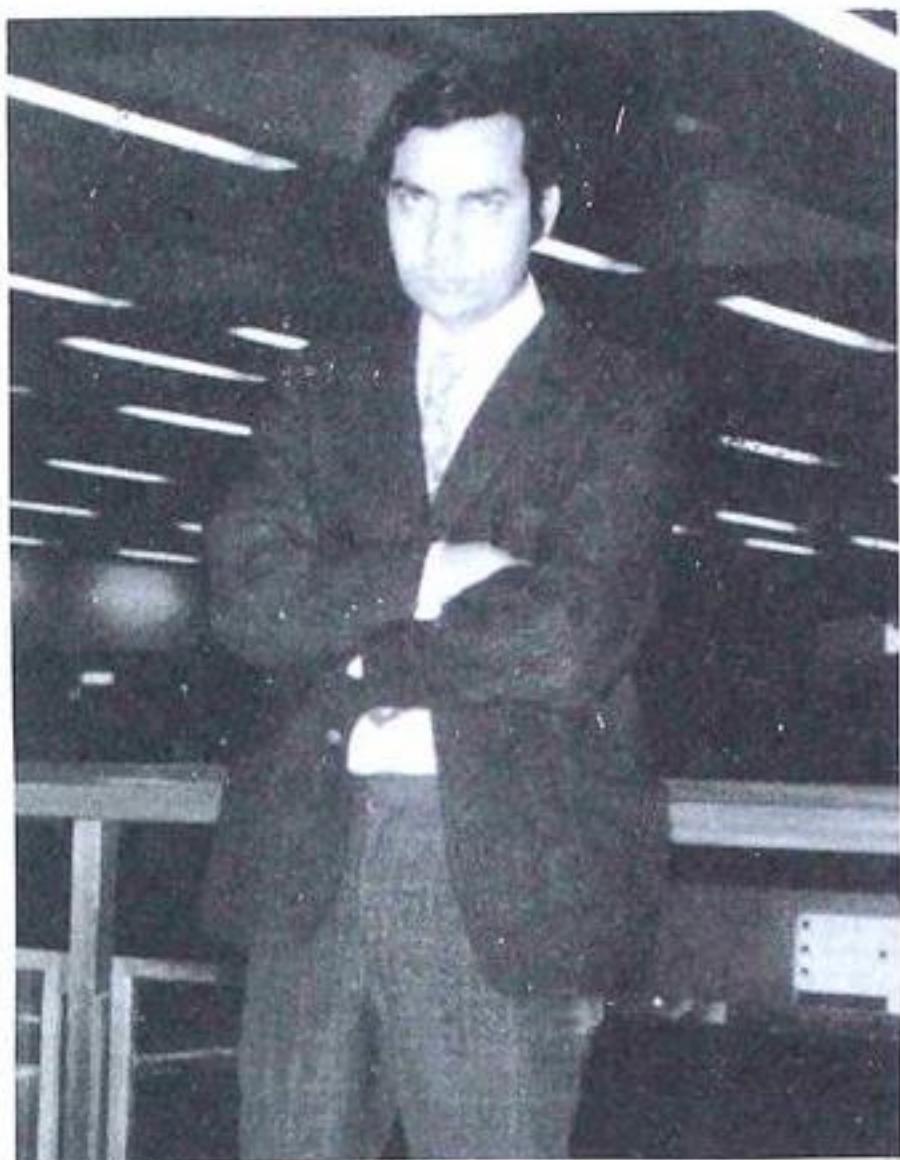
وغیرہ وغیرہ۔

حضرت فیض احمد فیض نے ڈاکٹر صاحبہ کو ''طوطیِ پاکستان'' اور حضرت جوش ملیح آبادی نے ''تحریک کی شہزادی'' کا خطاب عطا کیا۔

فہرست مضامین

انتساب

عالمگیر شہرت یافتہ صحافی و
دانشور سیدین (سعید نقوی)
کے نام جنہوں نے انگریزی
زبان کی آغوش میں آنکھ کھولی۔
مغرب کی فضاؤں میں ان کی خرد
کے اکھوئے پھوٹے۔ پرنسٹن
یونیورسٹی کی سحر خیزی نے ان
کی ذکاوت کو جلا بخشی فوارے کی
طرح بلند ہوئے لیکن زمین سے ان کا رشتہ جڑا رہا۔

میرؔ و غالبؔ، انیسؔ و اقبالؔ کے کلام کا انگریزی زبان میں اتنا حسین ترجمہ کیا کہ فیض احمد فیضؔ، آل احمد سرورؔ، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے جید عالموں سے اپنے حسن تخیل کا خراج وصول کیا اور اردو زبان اور جنوبی ایشیا کی تہذیب کا غرور بن گئے۔

ہدیہ تشکر

محترم علی سردار جعفری کی شخصیت ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا انیست'' کی منزل پر ہے۔ وہ اردو ادب کے تاجدار ہیں۔ ان کی پختگی نظر اور شعلگی فکر موجودہ عہد کے شعور میں لہو کی طرح گردش کر رہی ہے انہوں نے ذکاوت بیزار اور جہل افروز ماحول میں اپنی بصیرت سے سینکڑوں بصیرت کے چراغ جلائے ہیں۔ ان کی تابانی فکر کے پاس سے جو گزر گیا وہ پارسا بن گیا اور جس نے انکار کیا وہ کافر ٹھہرا۔

ایسی تاریخ ساز شخصیت کا میرے مسودے پر نگاہ کرم کرنا میرے لئے باعث صد ناز و افتخار ہے۔ اور یہی بات اس کتاب کی اشاعت کی محرک بھی ہے۔

اس کے علاوہ میں عظیم المرتبت مفکر سید محمد تقی، قندیل صفت ادیب پروفیسر علی رضا حسینی، شبنم ریز فنکار صلاح الدین پرویز، پختہ نظر شاعر مرزا عابد عباس کی احسان مند ہوں جن کے مشورے میرے لئے مشعل راہ بنے۔ اس کے علاوہ میں معروف مصورہ محترمہ ساجدہ تقی کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے تخلیق کی گنگا بہا کر میری کتاب

کو زینت بخشی۔ مصوری کی دنیا میں بلال احمد ایوبی کا فن اونچائی، مضبوطی اور پاکیزہ کا نشان ہے انہوں نے کتاب کا سر ورق بنا کر مجھے سرخرو کیا۔

اس کے علاوہ میں محترم کرنل سید غلام حسن نقوی صاحب کی بھی ممنون ہوں جو اپنی ذات میں دبستاں ہیں۔ محترم علی حیدر صاحب اور محترم غلام حیدر صاحب کی بھی دل سے شکر گزار ہوں جن کے خلوص و محبت نے مجھے حوصلہ بخشا۔

میں اپنی یہ حقیر سی پیشکش اپنے اجالا ذہن رفیقوں کے نام پیش کرنے کی جسارت کرتی ہوں

"گر قبول افتد"

عالیہ امام

پیش لفظ

میری یہ کتاب ''صبح کی مانند ترانام''، کسی مستقل علمی کارنامے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تاہم صورت حال کی دشواریوں، سیاسی و سماجی الجھنوں اور ضرورتوں کے تقاضے کبھی تہی مائیگی کو بھی غنیمت سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کتاب میں میرا روئے سخن علماء سے نہیں بلکہ عام لکھنے پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں پڑھنا اور اسے سمجھنا چاہتے ہیں۔

انسان نے وقت کے پھیلاؤ میں زندگی گزارنے کے ساتھ ہمیشہ اپنے وجود کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کیا ہے؟ اس کی تخلیق کے معنی کیا ہیں؟ کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ اس کا مقصد حیات کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر عہد کے مفکرین، ادباء اور دانشوروں نے دینے کی کوشش کی ہے اور انسان کی بزرگی کے متعلق یہ فیصلہ سنایا ہے کہ اس کا وجود ارتقاء کی طرح ناپیدا کنار ہے۔ وہ کائنات کی لو ہے۔ زمین کی جگمگاہٹ ہے۔ اور خدا کے کردار کی پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کی مہذب دہلیز پر قدم رکھنے کے باوجود آج یہی انسان لہو کا فوارہ بنا ہوا کھڑا ہے۔ اس

کے چاروں طرف سرمائے کے شعلے رقصاں ہیں جنہوں نے اس کے دل کے چاند کو بھٹی کی طرح جلا دیا ہے۔ اندھی عقیدتوں کے قد آدم ناگ اپنے پھن اٹھائے اس کے وجود میں زہر انڈیل رہے ہیں۔ اس کی زندگی کے کھنڈر میں ہزاروں مضطرب روحیں بھٹک رہی ہیں۔ امید کا ہر در بند ہے۔ ارد گرد آگ پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے سنگین حالات میں سوال یہ ہے کہ زمین پر تیرگی نے جو ڈیرا ڈالا ہے اسے کیسے کاٹا جائے ؟ سرمائے کے خونی جبڑوں سے اسے کیسے چھڑایا جائے ؟ اور اس کی خالی کٹورہ آنکھوں اور جھلسے ہوئے ہونٹوں میں زندگی کی شراب کیسے انڈیلی جائے ؟

دنیا کے عظیم مفکرین اور ادباء کی طرح اردو ادب کی دنیا میں میر تقی میر، غالب، انیس اور اقبال نے بھی اپنے اپنے زاویہ نگاہ اور نظریے کے مطابق اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ ان کی تمام تر شاعری اسی تصور کے گرد طواف کرتی ہے جو سبب اور نتیجے کے تعلق کو تجریدی اور مطلق نہیں بلکہ متحرک اصولوں کی مدد سے سمجھنا چاہتی ہے۔ ادب، زندگی، آسودگی اور آزادی کے تعلق کا یہی مطلب ہے اور ادب میں حقیقت نگاری کا بھی یہی مفہوم ہے۔

عظیم المرتبت شاعر فیضی کا مشہور مصرعہ ہے کہ "از شعلہ تراش کردم حرف" میر، غالب، انیس و اقبال کی شاعری اسی کے مصداق ہے۔ ان

کا ہر حرف شعلوں سے تراشا ہوا ہے۔ روشن، مضطرب، متحرک، انہوں نے انسانی عظمت کے ترانے گاتے ہوئے ایک بہت بڑے آتش کدے کو اپنے سینے میں روشن کیا۔ لیکن اس آتش کدے میں شعلے اسی وقت بھڑکتے ہیں جب حقیقت کا ادراک اور اس کا آئیڈل فنکار کے شعور میں لہو کی طرح گردش کرنے لگتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا نشانہ ہو

یونانی دیوتا کی طرح اپنے سینے کا گھاؤ چھپا کر دوسروں کے زخمی سینوں میں پھول بن کر کھلا دیتا ہے۔
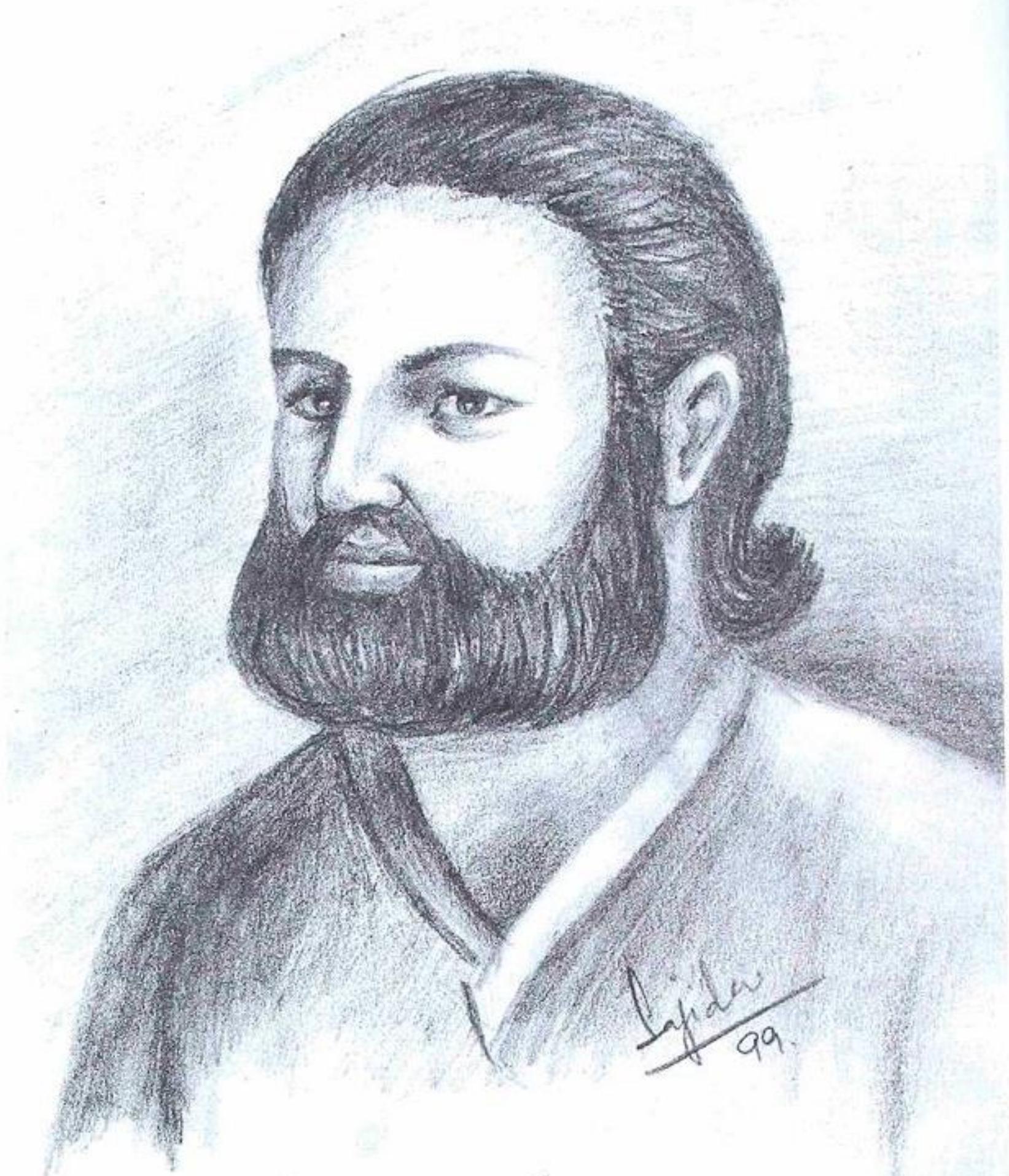
ریگستان میں فکر و عمل کی جوت جگانا کٹھن عمل ہے۔ اس کے لئے جذبے کے خلوص کے علاوہ استقامت کی معجزہ سامانی بھی درکار ہے۔ میری یہ کوشش کئی سال کے مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے جسے اگر وسعت نظر سے پڑھا جائے تو خیال و نظر کے لئے کچھ مواد مل سکتا ہے۔

اس کتاب میں ممتاز ڈرامہ نگار اور نقاد محمد مہدی کا مضمون ''لہجہ اور بھاؤ'' ''میر انیس کی شاعری کے دو اہم عناصر'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ خیال ہے کہ شاید اس کے پڑھنے سے ہماری بند کھڑکیاں کھلیں اور روشنی و تازہ ہوا اندر آئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ بھی ہے کہ اس

مضمون اور اس کتاب سے چند ثقہ قسم کے حضرات کی ذہنی عادت کو کہیں ٹھیس نہ پہنچے۔ اور وہ حسب دستور گلباری کی جگہ سنگ باری میں ہی اس کا مداوا تلاش کریں۔ تو ان کی خدمت میں بس اتنا ہی عرض ہے کہ تخلیقی و تنقیدی ادب سے سروکار رکھنے والوں کے شعور کی دنیا مختلف ہونے کے باوجود اتنی مختلف نہیں جتنی کہ فرض کرلی گئی ہے۔

بہر حال تمام زندگی جس فلسفے اور اصول نقد کو سائنٹیفک، صحیح اور مفید سمجھا اس کا اظہار ناگزیر ہے۔

میر تقی میر

میر تقی میر

انسان کائنات کا سب سے دلچسپ معمہ ہے۔ کیونکہ یہی انسان ہے جو کہیں فرشتہ بنتا ہے، کہیں شیطان، کہیں انسان کہیں حیوان، کہیں موسیٰ کہیں فرعون، کہیں محمدؐ کہیں ابو جہل، کہیں حسینؑ کہیں یزید۔ دونوں قسم کی شخصیتیں ماں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں لیکن دونوں دو تصورات حیات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ایک تصور حیات حسن، امن، محبت، پھول، کتاب اور آزادی کو اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ آزادی و حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل نہیں بلکہ افادی عمل بھی ہے۔ ہر وہ شئے جو زندگی کو بحر بیکراں، روح کو مترنم، دماغ کو روشن اور نفس کو طہارت بخشتی ہے۔ وہ حسین ہی نہیں مفید بھی ہے۔ یہ تصور حیات عمومی ذوق کی صرف تسکین نہیں تربیت بھی کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ امن و آزادی کے تصورات کتابوں میں پڑھنے، منبر و مسجد سے بیان کرنے اور فرصت کے لمحوں میں غور کرنے کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے معنی اسے زندگی بنا لینے کے ہیں۔ ہر آن، ہر لمحہ اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرنے کے لئے۔ کیونکہ اندھیرے کا اپنا کوئی وجود

نہیں۔ روشنی کے نہ ہونے ہی کو اندھیرا کہتے ہیں۔

دوسرا تصورِ حیات اپنے لئے فلک بوس محلات تعمیر کرتا ہے۔ تین طرف اندھیرے کو رواج دیتا ہے۔ تعصّبات کے ذریعے نچلی صفوں کو درہم و برہم کرتا ہے۔ نفسا نفسی اور خود غرضی کے جذبے کو جنم دیتا ہے۔ یہ انسان کو جہل، تاریکی، نفرت اور زرگری کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیتا ہے۔ جنگ اس کا مقدر، اسلحہ سازی اس کا ایمان ہوتا ہے۔ یہ ہری گھاس چرنے کی ہوس میں انسانی گھاٹ پر قبضہ جماتا ہے۔ یہ انسانوں کو دھان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر جنگ کے ایندھن میں جھونک دیتا ہے اور اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔ اس نظریئے پر پلے ہوئے انسانوں میں جذبات کے طوفان، تعجیل کی پھسلن، خود غرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، اقتدار کی ہوس، تعصّبات کے اندھیرے اور مکر پر عوامی لبادہ ڈال کر انسان کو ڈسنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ امن و آزادی کے کھلے دشمن ہوتے ہیں۔

امن و آزادی کے نظریات و تصورات انسانی ارتقاء کی طرح ناپیدا کنار ہیں۔ یہ انسانوں کے صدیوں کے اجتماعی عمل کا تعطر ہیں۔ یہ کھیتوں سے اگلتا ہوا سونا، اوزاروں کی چوٹ سے نکلا ہوا کندن، اور جہل کے ریگزار میں چاندنی کی مسکراہٹ ہیں۔ اس لئے ہر دور اور ہر عہد کے انسان نے ان نظریات کو پانے کے لئے نفرت کے ریگزار میں امن و آزادی کی جوت

جگائی۔ آگ و خون میں حق و صداقت کے پھول کھلائے۔ اور انسانی شکل میں ڈھلے ہوئے قد آدم شعلوں' اور ناگوں کی طرح پھن اٹھائے ہوئے جنگ زدہ نظریات و تصورات کے خلاف علم جہاد بلند کیئے۔

ارسطو اور افلاطون کے وقت سے لے کر "نیو ورلڈ آرڈر' اور "حقوق انسانی" کے مختلف نظریات و تصورات تک ہر دور میں امن و آزادی کے تصورات و نظریات کی سینکڑوں تعبیریں کی جا چکی ہیں۔ کوئی امن و آزادی کے تصوارت کو مطلق مانتا ہے اور کسی کے نزدیک یہ جبلی قوتوں کے اظہار کا نام ہے۔ ایک نقطہ نگاہ فرد کی آزادی کا قائل ہے تو دوسرا فرد کی آزادی کو جماعت کا پابند گردانتا ہے۔ کسی کو جمہوری نظام میں فرد کی آزادی پھلتی پھولتی نظر آتی ہے تو کسی کو اشتراکی نظام میں اس کی ضمانت ملتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امن و آزادی کے تصورات مجرد نہیں ہیں۔ سماج سے الگ ان کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ نظریات سماجی نظام انصاف سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق محض خیال سے نہیں بلکہ مادی زندگی بسر کرنے کے طریقے سے ہے۔ اس لئے دنیا میں جتنے بھی انقلابات ہوئے ان کی تہہ میں ہمیشہ اقتصادیات کی گتھیاں کار فرما رہی ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ امن و آزادی کی یہ جدو جہد ہمیشہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ہو بلکہ یہ اپنے ہم قوموں اور ہم مذہب کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی طبقاتی

معاشرے میں جہاں ایک طبقہ اپنے نظریات کا جال بچھا کر دوسرے طبقے کو غلامی پر مجبور کرتا ہے۔ وہاں آزادی کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک سیاسی آزادی اور دوسری معاشی آزادی۔۔۔۔ ایشیا، افریقہ اور تیسری دنیا کے ممالک میں یہ جدوجہد ساتھ چلتی ہے کیونکہ معاشی آزادی کی خواہش ہی سیاسی آزادی کی بنیاد بنتی ہے۔

تمام سوشل سائنسز کی طرح فنون لطیفہ کی تہہ میں بھی استحصالی قوتوں سے نجات حاصل کرنے، قیود کو توڑنے اور جہان تازہ آباد کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ یہ جذبہ فنکار کے شعور میں اس شدت احساس کا مظہر ہے جو غلامی اور تقلید کے خلاف اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اظہار یا تو وہ خیالات کی ترتیب و تنظیم، معاشی و سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں تلاش کرتا ہے یا جمالیاتی نقطہ نظر کے تحت ہیئت کے تجربوں میں نمایاں کرتا ہے اس طرح ادب میں امن و آزادی کے تصورات فلسفیانہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

امن و آزادی کی یہ خواہش خواہ خطاط میں ہو یا نقاش میں، مصور و شاعر میں ہو یا فلسفی و مفکر میں، اس انسان کے لئے ہے جو مرکز کائنات ہے۔ جو "خبیر" "بشیر" اور "نذیر" ہے۔ جس کی ذات سے ہر حکم صادر ہوتا ہے۔ "گستاخی فرشتہ" بھی جس کے حضور پسند نہیں۔

اس لئے دنیا کا جتنا بھی عظیم ادب ہے۔ اس کا موضوع ہمیشہ یہی

انسان اور اس کی آزادی و امن کا تصور رہا ہے۔ شیکسپیئر، ملٹن، گوئٹے، فردوسی، حافظ، غرضیکہ سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں اسی انسان کے حقوق کی بات کی ہے اور اس کی آزادی کی تعبیریں کی ہیں۔ اردو ادب میں بھی یہی انسان "مرکز پرکار عشق" رہا ہے جس کے وجود سے رنگینیوں کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ جس کی عظمت کے لئے جہاد "جہاد اکبر" ہے۔ لیکن اس انسان کی بڑائی کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہئے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ ناخدائے سخن میر تقی میر نے اس کا سراغ یوں لگایا ؎

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا نشانہ ہو

اور یہ سعادت ان سورج بنسی انسانوں کا مقدر بنی جنھوں نے یونانی دیوتا کی طرح اپنے سینے کا گھاؤ چھپا کر دوسروں کے زخمی سینوں میں پھول بن کھلائے اور ذلت خوردہ انسان کی زندگی میں بہار کے امکانات روشن کیے۔ اردو ادب کے نگار خانے میں ایسے چار انسان خصوصیت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ایک میر تقی میر، دوسرا غالب، تیسرا میر انیس اور چوتھا اقبالؒ۔

ممتاز امریکن نقاد Malcolm Cowley نے اپنے ایک مضمون "شاعر اور فن کار" میں ایک مقام پر بہت دلچسپ بات کہی ہے کہ "شاعر کو دنیا نے ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔" کاؤلی کا یہ بھی خیال ہے کہ "فن کی عظمت کی

خاطر شاعر کو شعوری طور پر کوشش کرنا چاہیئے کہ وہ زمانے کی غلط فہمیوں کا شکار رہے۔" اردو ادب میں کم از کم میر تقی میرؔ اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ جن کے ساتھ زمانہ اب تک انصاف نہیں کر سکا۔ وہ ان مظلوم فنکاروں میں سے ہیں جن کے انسان کی افسردگی ناقدین کی دین ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اپنے کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے انسان کو غلط سمجھا۔ اور دنیا کے سامنے غلط طریقے پر پیش کیا۔ ان کی عظمت مسلم مگر عظمت کی بنیاد محض ان کے انسان کی دل کی بربادی نہیں بلکہ اس کی آبادی پر بھی ہے۔ میر خود اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے۔

دل وہ نگر نہیں جو پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

اس شعر میں انسان کی زندگی کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کی ترجمانی ملتی ہے لیکن زور مثبت پہلو پر ہے۔

یہ بھی ایک عجیب و غریب حقیقت ہے بلکہ زمانے کی ستم ظریفی کہیے کہ میر کے انسان کے بارے میں مولوی محمد حسین آزاد کے وقت سے بازار میں جو سکہ رواں ہے وہ آج تک چل رہا ہے۔ ان کے انسان پر ہر شخص کو

محض حزن ویاس کا سایہ نظر آیا۔ اور بس۔ حالانکہ میر کے انسان کی شخصیت تہہ در تہہ بھی ہے اور سیدھی و شفاف بھی۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ وہ خارجی پیکر میں داخلیت کی روح کچھ اس طرح سمو دیتا ہے کہ ہر شخص اس میں اپنے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے۔ اس کی آنکھ بھی "دیدہ بینا" لئے ہوئے ہے اور دل بھی۔ داخلیت اور خارجیت کا یہی امتیاز میر کے انسان کی بلندی کی دلیل ہے۔

میر کے انسان کی محزوں مزاجی فطری نہیں بلکہ حالات کی دین ہے۔ اس کا ماتم سماج پر ہے۔

میر رونے کی حکایت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

میر کے زمانے میں جو سماجی انتشار اور مزاج تھا۔ اس کی بوسیدگی "کاغذ نم" سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس نمی کے اثرات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد تک قائم رہے۔ اہل حرفہ تباہ حال تھے۔ شرفاء پریشان' بادشاہ وقت شاہ شطرنج۔ انسان کی قدر اس دور میں کیا ہو گی؟ میر کے انسان کے گھر کا ہو بہو نقشہ انتزاع سلطنت کا نقشہ ہے ؎

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
جی ڈبا اور چھاتی بھی ڈبکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے یک خرابی گھر در سے

ایک شہرہ ہے شہر دلی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا

بانس کی جادے ہیں سر کنڈے
وہ بھی بیہون میں سب موے ٹھنڈے

کل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

"شیخ چلی کا روضہ" "پاکھوں کا گیلا رہنا" "گھر در سے خرابی کا برسنا" "مٹی کا کہیں کہیں بھسکنا" دو چار درے رکھ کر دیوار کا جلدی جلدی درست کرنا" یہ تمام وہ باتیں ہیں جو حقیقت بھی ہو سکتی ہیں اور استعارہ بھی۔ اگر یہ سب حقیقتیں ہیں تو یہ میر کے انسان کی زبوں حالی کا ماتم ہیں جو خاندانی

شرافت و نجابت کے علاوہ ایک ''فن شریف'' کا مالک بھی تھا۔ اور اگر استعارہ ہے تو سماجی انتشار اور سراسیمگی کا نوحہ۔ ان حالات میں اگر خوددار انسان کا غرور فن تکبر کی حدوں سے گزر کر جنون تک پہنچ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ دیوانگی' زندگی سے گریز نہیں بلکہ ناموافق حالات سے لڑنے کا عزم ہے۔

سر شاہ سلیمان مرتب ''مثنویات میر'' کے خیال میں میر کے انسان کا جنون موروثی نہیں بلکہ ناموافق حالات کا منطقی نتیجہ ہے۔ بلوغ کی منزل پر پہنچنے سے پہلے وطن کا چھوڑنا' بھائیوں کی طوطا چشمی' احباب کی بے مروتی' اپنی بے سروسامانی' ان تکلیف دہ حالات میں میر کے انسان کے پاس سوائے سرمایہ دل کے اور کیا باقی تھا۔ یہی ایک شیشہ تھا جسے وہ ہر پتھر سے ٹکرا رہے تھے۔ دلی پہنچ کر بھی سکون نہ ملا۔ غالباً دلی کی وہی تعریف انھوں نے اکبر آباد میں سنی ہوگی۔ جس کا اظہار انھوں نے لکھنؤ آکر اپنے مشہور و معروف قطعے میں ''تھا'' کے ساتھ کیا ہے۔ حال اور ماضی کا یہ فرق ممکن اور موجود کا فرق تھا۔ امید اور نا امیدی کی کشمکش۔

دلی کہ ایک شہر ہے عالم میں انتخاب
رہتے ہیں منتخب ہی وہاں روزگار کے

مگر اس جنت ارضی میں پہنچ کر میر کے انسان پر کیا گزری۔ اس کا ذکر انہیں

کی زبانی سنیئے۔

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جو رگ دوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا ضبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

میر کے انسان کا ''کف بلب'' رہتے ہوئے ''سنگ بدست رہنا'' خالی از معنی نہیں۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ میر کا انسان جینا چاہتا تھا۔ زندگی کو بہت کچھ دینا چاہتا تھا لیکن سماج نے اسے سنگ دیئے۔ میر کے انسان کے ذہنی رویے کو موجودہ دور کے تشدد' نفرت اور جنگ زدہ ماحول میں اگر دیکھا جائے تو نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہوگا۔ جب معاشرہ سماجی عدل وانصاف سے منہ موڑ کر ''خدا کی چند برگزیدہ ہستیوں''

ہی کو سیراب کرتا ہے۔ تو ہر انسان پھر سراپا "سنگ بدست" ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ آخر غالب کے انسان کو بھی کہنا پڑا۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دیو جانس کلبی باوجود اندھے ہونے کے اپنے ہاتھوں پر چراغ رکھ کر چلاتے تھے اور جب لوگ پوچھتے تھے تو یہی کہتے تھے۔

از دام و ددگریزم و انسانم آرزوہست

میر تقی میر کے اس انسان نے آگرے میں تنگ دستی کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ تلاش روزگار کی چلچلاتی دھوپ نے ہمیشہ اسکا تعاقب کیا۔ سائے میں بیٹھنا کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی صورت حال سے ہمیشہ دوچار رہے۔ کسی حوالے سے ایک روپیہ روزانہ وظیفہ ضرور مقرر ہوا۔ اور بس۔

فکر معاش یعنی غم زیست تا بہ کے
مر جایئے کہیں کہ ٹک آرام پایئے

گردش چشم سیہ کاسہ سے جمع نہ رکھو خاطر تم
بھوکا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو

رکھتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر

جینے کا اس سمے میں اب کیا مزا رہا ہے

بھری آنکھیں کسو کی پونچھتے گر آستین رکھتے

ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اس دست خالی سے

محتاج کو خدا نہ نکالے کہ جوں ہلال

تشہیر کون شہر میں ہو پارہ نان پر

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو

ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

ان حالات نے میر کے انسان کی زندگی کو شام غریباں بنا دیا۔ بگولے اٹھے، شعلے بھڑکے، پھر دور تک راکھ پھیل گئی۔ لیکن ایک خوبصورت پہلو جوان کے انسان کا ابھرتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے ان کڑے وقتوں میں بھی محبت ضرور کی۔ اور خوب ٹوٹ کر کی۔ لیکن اس میں "بوسے کو پوچھنے" کی فرمائش نہیں بلکہ ہمیشہ کچھ بجھی بجھی سی کیفیت ہی رہی۔

شام ہی سے کچھ بجھا سا رہتا ہے

دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

شوخی کی جگہ سادگی، اور ''دھول دھپے'' کی جگہ معصومیت اور پرستش کا ایسا انداز ہے کہ اگر محبوب کی طرف سے یہ کہہ دیا جائے کہ

ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

تو یہاں سے جواب بس اتنا ہی ہے

''پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے''
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

سپردگی اور پرستش کا جذبہ پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یہاں تک کہ وصل میں اگر کبھی وارفتگی کی حالت طاری بھی ہوئی۔ تو دوسرے لمحے سلیقہ درمیان میں آ گیا ہے۔

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
الا کھینچ بغل میں تجھ کو' دیر تلک ہم پیار کریں

پھول گل' شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمہیں بھائے بہت

برافروختہ رخ ہے اس کا کس خوبی سے مستی میں
پی کے شراب شگفتہ ہوا ہے اس نوگل پہ بہار آج

اس کا بحر حسن سراسر اوج موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

درد اور مہذب درد میر کے انسان کی پہچان اور اس کا ایک حسین پہلو ہے۔ ایسا درد جو ہر کیفیت سے گزر جانے کے باوجود ہر وقت دل کا گھیراؤ کئے ہوئے ہے۔

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

دہلی میرؔ کے انسان کی کروڑوں حسین یادوں کی جھرمٹ تھی لیکن جب ظالموں نے ''اوراق مصور'' بکھیر دیئے۔ ''تصویر'' مسخ کردی گئی۔ آزادی فکروفن کے تاروپود بکھیر دیئے گئے اور پوری زندگی مقتل بن گئی۔ تو پھر میر کا یہ بیدار نظر انسان تڑپ اٹھا۔ درد پھیل گیا۔ جو آتشیں رخساروں سے گزرتا ہوا' زمین کے درد سے جڑ گیا۔ اس درد میں سرمدی کیفیت تھی۔ جس نے کمیں گاہوں میں چھپے ہوئے قاتلوں کو یوں للکارا۔

جفائیں دیکھ' یہاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
تری گلی سے سدا اے کشندہ عالم
ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

ظالم زمین سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمین میں ہاتھ کسو داد خواہ کا

انسان کی بے حرمتی دیکھ کر قلم سے یوں شعلے ٹپک پڑے۔

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک
کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہ ہو

یک جا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ
جس میں بجائے نقش قدم چشم تر نہ ہو

ہر اک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے
ہاں ہاں کسو شہید محبت کا سر نہ ہو

یا

سبزان تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھئے تو واں نہیں سایہ درخت کا

جوں برگہائے لالہ پریشان ہو گیا
مذکور کیا ہے اب جگر لخت لخت کا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

خاک سیاہ سے جو برابر ہوا ہوں میر
سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

ظلم کے مقابلے میں مظلومیت کا جلوس اس جاہ و حشم سے نکالا۔

ہم بھی چلتے ہیں اک حشم لے کر
دستہ داغ و فوج غم لے کر
دست کش نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں علم لے کر

چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدان عشق ہیں
تیرا گزار تا کہ کسو نعش پر نہ ہو

حیراں ہوں میں کہ ایسی یہ مشہد ہے کون سی
مجھ سے خراب حال کو جس کی خبر نہ ہو

آتا ہے یہ قیاس میں اب تجھ کو دیکھ کر
ظالم جفا شعار ترا راہ گزر نہ ہو

اس ظلم کے نتیجے میں دہلی لہو کا پرچم بنی ہوئی تھی۔ ہر شخص زنجیر بکف تھا۔ آزادیٔ فکر و نظر کی قندیلیں گل کر دی گئی تھیں۔ درد کا شجر پھیل رہا تھا۔ ظلم سے نجات کیونکر ملے؟ نگاہوں کے سامنے دھواں تھا۔ تصوف سہارا تھا۔ یہ فلسفہ اس عہد کی پہچان تھا۔ جہاں امیر و غریب سب برابر ہیں۔ مرنے کے بعد سب کا ایک حال ہے۔ لیکن میر کے انسان کی بیدار نگاہی ظلم سے انتقام لینے کی بھی راہ دکھارہی تھی۔ جو بتارہی تھی کہ خون سو شکلیں بن کر ابھرتا ہے۔ وہ کمین گاہوں سے جلادوں کو نکال لاتا ہے۔ اور انہیں دار پر پہنچادیتا ہے۔

حاکم شہر حسن کے ظالم ستم ایجاد نہیں
خون کسو کا کوئی کرے واں داد نہیں فریاد نہیں

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے ہاتھ سو پانی سے دھو دے گا

اس لئے اس کے قلم سے یوں شعلے ٹپک رہے تھے۔

خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے
قتل کرتے کرتے تیرے تئیں جنوں ہو جائے گا

یا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

میر کے انسان کا یہ انداز اپنے عہد کے سفاکانہ طرز حیات کے خلاف اعلان جہاد تھا۔ جس میں خیال کی پختگی، تجربے کی سچائی و خلوص اور مشاہدے کی وسعت و گہرائی سب شامل تھی۔ سیاسی و سماجی سطح پر مطلع صاف نہیں تھا۔ چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ منزل عشق تک پہنچنے کے سارے راستے محدود و مسدود تھے۔ لہو کا چھڑکاؤ دیکھ کر کبھی دامن پہ ہاتھ مارتے اور کبھی یہ کہہ اٹھتے۔

ہمت دے باد تند کو ایسی کہ بعد مرگ
مشت غبار میرا نجف پہنچے یا علیؑ

عز و وقار کیا ہے کسو خود نما کے ہاتھ
ہے آبرو فقیر کی شاہ ولاؑ کے ہاتھ

دل کی گرہ نہ ناخن تدبیر سے کھلی

عقدہ کھلے گا میر یہ مشکل کشا کے ہاتھ

غرضیکہ میر تقی میر کے انسان کی فکر مرتب اور ذہن ہمہ گیر تھا۔ اس میں ارادے کی قوت' اجتہاد فکر اور حس جماعتی تھا۔ مخالف قوتوں کے سامنے ثابت قدمی اس کا طرہ امتیاز تھا۔ خود غرضی کے فریب' تعصبات کے جھاڑ جھنکاڑ اور غیر عقلی وابستگیوں سے اس کا دامن پاک تھا۔ ایسے 'انسان' کو میر جس وقت وہ ظلم وستم کی چکی میں پستے دیکھتے تو ان کا قلم شعلہ گیر ہو جاتا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا 'انسان' امن و آزادی کی چھاؤں میں زندگی گزارے۔ لیکن جب حالات اس کے برعکس رخ اختیار کرتے تو وہ کبھی نظام پر برستے اور کبھی اپنے عقیدے کے مطابق شاہ نجف کو آواز دیتے۔ لیکن یہ سب رنج و غم اس 'انسان' کے لئے جو مرکز کائنات ہے اور درد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

مرزا غالب
Sajida
۹۹

غالب

غالب کے انسان کو آج مختلف انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن اسے سمجھنا آج بھی اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ اس کے زمانے میں تھا۔ اس لئے کہ جب مختلف اور متضاد خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزریں تو کوئی دوٹوک بات کرنا آسان نہیں۔ وہ آج بھی گرمی نشاط کے تصور سے اسی طرح نغمہ سنج ہے جس طرح پہلے تھا۔ خدا معلوم یہ ''گلشن ناآفریدہ کب'' پیدا ہوگا۔ جو اس کی نغمہ سنجی کی روح کو سمجھ سکے گا۔ شعور ذات، شعور فن، فکر و عمل، رجعت و ترقی، مجتہدی و مقلدی، قنوطیت و رجائیت کے مختلف عناصر کا ایک ذات میں جمع ہو جانا کسی طرح مجموعہ اضداد سے کم نہیں۔ جو شخص ایک طرف یہ کہے کہ

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہ بہادر شاہ کی شان میں قصیدے لکھے۔ مشاعروں میں ستائش کے صلے میں شرکت بھی کرے۔ طرز بیدل میں ریختہ کہتے کہتے طرز میر تک آپہنچے۔ اس کے خیالات میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے؟ معلوم نہیں فنی

اصطلاح میں یہ نادرہ کاری ہے ؟ یا عجوبہ کاری ؟ یا شاہد واقعات کا مشاہدہ ؟ یا عارف باصفا کا عرفان نفس ؟ جس نے جو کچھ دیکھا بس لکھ دیا۔ آخر ہر بات میں ترتیب و ہم آہنگی کا خیال کیوں ؟ جب چاہا زمانے کو اپنا لیا۔ جب چاہا بغاوت کر دی۔ اگر ایسا ہے تو غالب کے انسان کی بزرگی کا دارومدار کس چیز پر ہوگا ؟۔۔ کیا فلسفہ تضاد سے اس انسان کی عظمت مجروح نہیں ہوتی ؟ اس کی فکر کا تانا بانا آخر کس چیز سے تیار ہوا ہے ؟ کیا اجتماع ضدین زمانے کا مزاج تھا یا اس کا اپنا ؟

اگر دوسری بات سچ ہے تو پھر اس بنیادی مزاج کے عناصر تلاش کرنا پڑیں گے۔ روایت پرستی یا تشکیک' تقلید یا اجتہاد۔ برکلے کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنے "مکالمات" میں Matter کی نفی اس عنوان سے کی کہ ڈاکٹر جانسن نے کتاب اٹھا کر پھینک دی اور کہا۔ اگر کچھ بھی نہیں ہے تو پھر یہ "میں" کیا ہوں اور اس سوال نے اسے پھر حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔

غالب کے انسان کی کہانی بھی کچھ اسی انداز کی ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے انسانوں کی بے حرمتی کی ہزاروں داستانیں گزریں۔ ظلم کے سامنے اس نے اپنے آپ کو اس حد تک بے سہارا محسوس کیا کہ برکلے کے انداز میں یہ کہہ بیٹھا۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس لئے حقیقتیں اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آنے لگیں۔ وہ دنیا کی حقیقتوں کو جامد تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حقیقت کی جستجو نے اسے تشکیک کی منزل پر پہنچادیا۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

موحد ہونے کے باوجود وہ اس حقیقت سے اپنا دامن بچا نہیں سکا۔

آیندہ و گذشتہ تمنائے حسرت است
یک حرف "لا" بود کہ بہ ہر جا نوشتہ اند

"لا اور الا"۔ زندگی کی تعمیر و تخریب، تدوین و تنظیم کا اشارہ ہوتے ہوئے بھی زمانے کی دست برد سے بے نیاز نہیں۔ 'لا' سے الا تک پہنچنے کی منزل تشکیک ہی کے راستے سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہاں انسان توازن کھو سکتا ہے۔ اگر اس میں درک و ادراک کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ علم کی ابتداء تشکیک و تادیب ہے اور انتہا عرفان و آگہی۔ سچی بات یہ ہے کہ

Knowledge begins in doubt but ends in certainly.

تشکیک و تادیب میں مبتلا ہو کر انسان یا تو جبری ہو جاتا ہے یا قدری۔ جبریت مایوسی کا اظہار ہے۔ تو قدریت احساس خودی کا۔ جبریت کے ماننے والے کو کائنات میں اپنی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ قدریت صالح تصور ہے۔

دیر و حرم کی تکرار سے آزاد۔ انسان پرستی کا سرچشمہ۔ قدری کو اپنے اختیار تمیزی پر اعتبار ہوتا ہے۔ جرات فکر و جرات عمل۔ تشکیک و تادیب کے روشن پہلوؤں کے ترجمان۔۔۔۔ غالب کے انسان کے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
وا ماندگی شوق تراشے ہے پناہ ہیں

غالب کے انسان کی جرائت فکر کا نتیجہ وہ مثنوی ہے جو ''ابر گہربار'' کے نام سے موسوم ہے۔ مادیت وروحانیت کی کشمکش۔

جدلیاتی حقیقت کی اس سے بہتر عکاسی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف زندگی کا ہمہ گیر نغمہ ہے۔ دوسری طرف افسردگی۔ سکوت اور جمود 'انسان' کی محبت اور والہانہ محبت میں وہ اس کا رازداں بننا چاہتا ہے اور زمین پر بکھری ہوئی ہر دولت میں وہ اسے شریک کرنا چاہتا ہے۔

غالب کا انسان وصل بے انتظار کا قائل نہیں۔ وہ نگاہ آشنا چاہتا ہے تاکہ ذوق تماشا کو تسکین مل سکے۔ وہ نگاہ بے جا کے ساتھ ''روزن دیوار'' کا بھی قائل ہے۔ اس کے یہاں ''ذوق تماشہ'' ''آئینہ رو'' ''روزن دیوار'' تینوں کا وجود ضروری ہے۔ اور فردوس اس ثلاثہ سے محروم۔ اس کے یہاں فردوس سے عدم الفت وانسیت کی وجہ یہی ہے۔ وہ دوزخ کو جنت سے اس

لئے ملانا چاہتا ہے تا کہ سیر کے لئے تھوڑی سی جگہ مل جائے اور یکسانیت ختم ہو۔

نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گرباشد ہمیں امروز من فردائے من

اس کے یہاں نغمے کا یہ خروش اسی تشکیک و تادیب کا رہین منت ہے جو اس کے فکر و فن کا بنیادی ستون ہے۔ تشکیک اگر حد سے بڑھ جائے تو یاسیت کو چھو لیتی ہے۔ لیکن غالب کے انسان کے یہاں ایسا نہیں۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اس میلان طبع کے ساتھ دوسری چیز جو جبریت کی طرف جانے سے روکے رہتی تھی۔ وہ اس کا عقیدہ وحدت الوجود تھا۔۔۔۔۔ جو اس زمانے کا چلن تھا۔ رند مشربی اور تصوف ہم معنی لفظ بن کر رہ گئے تھے۔۔۔۔۔ توحید کا اعتراف اور کیش ترک رسوم پر فخر۔۔۔۔۔ خفیہ و اعلانیہ۔ جرائت فکر کا ثبوت ہے۔

نہیں ہے سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برھمن کی آزمائش ہے

یا

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے

مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے

تشکیک اور آزادہ روی سے گزرتا ہوا غالب کے انسان کا ایک اور

پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ ہے الم پسندی۔ جہاں ذہن کی کیفیت یہ ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی

یا

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یا

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

غالب کے انسان کی اس الم پسندی' مایوسی اور ناآسودگی پر کچھ تو زمانے کے کیف و کم کے اثرات ہیں اور کچھ ماحول کے غالب کے باپ میر تقی میر کی طرح صوفی و درویش صفت نہیں تھے کہ وہ اس مقولے پر عمل کرتے۔ ''درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست'' ان کے ہاتھ میں افتخار نسبی کا ایک پیمانہ تھا۔ جس کی حفاظت ان کا فرض تھا۔ ایک کھاتا پیتا گھرانہ جو

سمرقند سے ہندوستان آیا اور یہاں آکر اعزاز کے منصبوں پر فائز ہوا۔ غالب کی غم فروشی والم پسندی دراصل ان کی خودپسندی کا عکس ہے۔ ان کی انا شکست خوردہ ہونے کے بعد بھی قناعت پسند نہیں تھی۔ باپ بچپن میں مر گئے۔ چچا جوانی کی منزل تک آتے آتے داغ مفارقت دے گئے۔ ننھیال میں پرورش ہوئی۔ دادیہالی فضا کا لطف نہیں مل سکا۔ چونکہ باپ کا سایہ نہیں تھا اس لئے لطافت تربیت سے محروم رہے۔ یہ سب کچھ تھا۔ پھر بھی فراغت نصیب تھی۔ لیکن جوانی سے بڑھاپے تک آتے آتے اس نظام نے دم توڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ فراغت اور عیش و آرام تھا۔ کشمکش حیات نے دوراہے پر کھڑا کر دیا۔ ان کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ تلخ حقیقتوں سے انکار بھی نہ کریں۔ اور زندگی کو حسن و خوبی سے گزار بھی لے جائیں۔ ان کی سلیم الطبعی نے انہیں آسرا دیا۔ لیکن جس چیز نے انہیں یاس پرست ہونے سے بچالیا۔ وہ ان کی خوداعتمادی تھی۔ اگر وہ یاس پرست ہوتے تو صرف ماضی کی طرف دیکھتے۔ ماضی پرست انسان کو چاروں طرف تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ ماحول کی تاریکی سے تو غالب کے انسان کو انکار نہیں تھا۔ مگر مایوسی کا اظہار اور چیز ہے۔ اور مایوس ہو کر ہاتھ پیر ڈال دینا دوسری چیز۔ کسی انسان کا یہ احساس بڑی چیز ہے کہ وہ نامساعد حالات میں فکروفن کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

یہ بات ان کے انسان کی خود اعتمادی پر دلیل ہے کہ اس نے اپنے اظہار فن کے لئے اس زبان کا استعمال کیا جو سکہ کاسد بھی تھی۔ اور طنز و تعریض کا شکار بھی۔ "طرز بیدل میں ریختہ کہنا۔۔۔۔اور فارسی کو سرمایہ افتخار سمجھنا۔ دو باتیں ایسی تھیں جو بتاتی ہیں کہ غالب کے انسان کو حالات سے لڑ کر زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا تھا اور یہی وہ سلیقہ ہے جو وہ اس طرح زمانے کو دینا چاہتا تھا۔

بوادی کہ در آں خضر را عصا خفتت

بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتت

"بہ سینہ می سپرم راہ" کا نتیجہ تھا کہ ان کا فن تلخی کام و دہن نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بن گئی اور انسان کو یہ بتا گئی کہ غم زندگی کی ارزانی نہیں بلکہ گرانجانی ہے۔ اگر کوئی اس بات کو سمجھ لے اور زندہ بھی رہنا چاہے تو نشاط زندگی کا سرمایہ بھی اسی غم کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ ایک فنکار کے لئے نشاط و کیف' نشاط سخن کا سرمایہ ہے۔ ان اشعار میں انہیں حالات کی طرف اشارہ ہے جس میں ایک طرف ماحول کی تصویر ہے دوسری طرف خود اعتمادی۔

شب از تیرگی اہرمن روئے بود
زسودا جہان اہرمن خوئے بود

نخلوت زتاریکیم دم گرفت
نشاط سخن صورت غم گرفت

زمانے کی شکایت کے ساتھ ان اشعار میں کتنی شگفتگی ہے۔ دنیا کی "اہرمن خوئی" کے بعد بھی نشاط سخن کا احساس۔ اور نشاط سخن کا صورت غم میں تبدیل ہو جانا۔ سماجی زندگی کا عمل اور رد عمل ہے۔ جس میں شخصیت کی خود اعتمادی اور خود پسندی کی لذت بھی شامل ہے۔ غم کی یہ اثر پزیری غالب کے انسان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

مرا بسکہ دامن اثر کردہ غم
بہ مرگ طرب و بہ گر کردہ غم

من از خویشتن بادل دردمند
نوائے غزل برکشیدہ بلند

غالب کے انسان کے پاس غم کا جذباتی پہلو بھی تھا اور فکری بھی۔ غم کیا ہے؟ غم کیوں ہے؟ غم کا اثر کن لوگوں پر شدید ہوتا ہے؟ "متاع بردہ اور عیش رفتہ" کی ترکیبوں کے استعمال سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ

ترکیبیں اگر محض نادرہ کاری ہوتیں تو بھی قابل قدر تھیں۔ مگر ایسا نہیں ہے یہ ترکیبیں غالب کے انسان کی داخلی و خارجی کیفیات کا اظہار ہیں۔ غم ایک فلسفہ نہیں بلکہ ایک تاریخ ہے۔ وہ تاریخ جس سے فلسفہ جمالیات کی ابتداء ہوتی ہے۔ ابن آدم کا لہو اگر زمین پر نہ گرتا تو آب و گل میں یہ سوز و ساز غالبانہ ہوتا۔ یہ اشعار محض جدت پسندی نہیں۔ تاریخی حقائق کا اظہار ہیں۔ جن سے انفرادی اور اجتماعی طور پر وہ متاثر ہے۔ ان ترکیبوں کے پیچھے اس کی زندگی اور اس کے انسان کی پوری تاریخ ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

''گل نغمہ'' ہو یا ''شکست آواز'' اس کے پس پردہ سماجی و تاریخی عوامل ہی کی کار فرمائی ہے اس انسان کی بڑائی یہ ہے کہ اس تاریک خلوت کدے میں بھی اپنا چراغ دل جلا کر وہ روشنی حاصل کر لیتا ہے۔

درآں کنج تاریک و شب ہولناک
چراغے کالب کردم از جان پاک

چراغے کہ بے روغن افروختم
دلے بود کز تاب غم سوختم

یہ چراغ بے روشن کیا تھا؟ یہ غالب کے انسان کا دل نہیں بلکہ اس کی زندگی اور زمانے کی پوری تاریخ ہے۔

ایک اور پہلو جو غالب کے انسان کا سامنے آتا ہے۔ وہ ان کی ماضی پرستی یا انانیت پسندی ہے کہ جس کی بنا پر وہ بار بار اپنا رشتہ افراسیاب سے جوڑتے ہیں۔ اور سمرقند سے رشتہ تعلق قائم کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ نہ ماضی پرستی تھی اور نہ انانیت پسندی۔ بلکہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے لئے راستہ پیدا کرنا تھا۔ اعزاز انہیں ہر قیمت پر عزیز تھا۔ وہ سپہ گری سے حاصل ہو یا شاعری سے' وہ سپاہی بننا چاہتے تھے مگر اس کے لئے حالات سازگار نہیں تھے۔ ان کے سماجی ماحول میں شاعری ذریعہ عزت تھی۔ شعراء کی قدر علماء سے زیادہ ہوتی تھی۔ لہذا یہ راہ اختیار کرنا پڑی۔ وہ اس پر راضی نہ تھے۔ بلکہ مجبور تھے ؎ "شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن من؟" لہذا غالب کے انسان کو یہ راہ اختیار کرنا پڑی۔

ایک اور پہلو جو غالب کے پردے میں اس کے انسان کا ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان کی دربار اور قصیدہ خوانی سے تنفر تھا۔ انہوں نے قصیدے کہے۔ آئمہ معصومینؑ کے قصیدوں میں خلوص و جذبہ ہے۔ لیکن ملکہ برطانیہ کا قصیدہ بے معنی ہے کیونکہ یہ اسکے خاندانی منصب کے خلاف تھا۔ لیکن حالات کی مجبوری نے کہنے پر مجبور کیا جو ایک طرح کا المیہ تھا۔

غالب کے انسان کی اس الم پسندی کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسے اپنے ہر انداز' ذہانت وذکاوت پر اعتماد بھی تھا اور ناز بھی۔ وہ کسی طرح صائب وکلیم سے اپنے کو فارسی دانی میں کم نہیں سمجھتے تھے اس کی ''انانیت یزداں گیر'' اور ''یزداں شکار'' تھی۔

نہ تھا کچھ' تو خدا تھا' کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

عظمت انسانی کا یہ راگ اردو میں اقبالؒ کے علاوہ کسی نے نہیں چھیڑا۔

ہم نہ ہوتے تو خدائی کے بھرم کھل جاتے
تیری ہستی کا پتہ ہے مرا انساں ہونا

مگر مور ناچتے ناچتے اپنے پیروں پر نظر کرتا ہے تو افسردہ ہوکر ٹھٹھک جاتا ہے یہ افسردگی فریب سادہ دلی نہیں بلکہ حقیقت بین اور رازہائے سینہ گداز ہے۔ کلیم کو شاہ جہاں مل گیا جس نے ایک قصیدہ کہنے پر اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ مگر غالب کے انسان کی یہ قسمت کہاں۔ قلعہ معلی آخری یادگار تھی۔ جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ شعر خوانی آلہ تفریح۔ شعر گوئی ضیاع وقت اس ناقدری کا یہ احساس۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

ماحول کا یہ جبر اندر کی یہ گھٹن۔ دو باتوں کی متقاضی تھی' بے لگام انانیت یا بے پناہ مایوسی۔۔۔۔۔ دونوں راہیں خطرناک تھیں۔ ان راہوں پر پڑ کر جو شخصیت بنتی وہ نفسیاتی نقطہ نظر سے انتہائی کج فہم و کج بین۔ اور عملی نقطہ نظر سے انتہائی غیر متوازن اور غیر معتدل ہوتی۔ غالب کے انسان کے آگے اتفاق سے دونوں راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کو توازن و اعتدال کی منزل تک پہنچنے کے لئے اس راستے سے گزرنا تھا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھا۔ لیکن جس چیز نے اس کو اس غلط روی سے بچالیا وہ اس کا احساس انفرادیت اور آرزو مندی تھی۔ اس کی انانیت میں ''نشاط سخن'' کی آمیزش ہے اور شکست خوردگی میں ''نشاط کار'' کی لذت۔ اور یہ ایسی فنکارانہ شخصیت کی تعمیر ہے جو ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز تھی۔ اپنے زمانے میں بھی اور اپنے زمانے کے بعد بھی۔ وہ الم دوست اور الم پسند ضرور ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم

آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

لیکن یہ حوصلہ مندی ہمیں زندگی سے مایوس اور ہراساں نہیں کرتی۔ بلکہ ناموافق حالات میں بھی زندہ رہنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ غالب کے انسان کے یہاں 'گلشن نا آفریدہ' سے زیادہ ''عندلیب گلشن نا آفریدہ'' کا

تصور حیات منتج ہے۔ یہ انفرادی بھی ہے۔ اور سماجی بھی۔ نیا انسان' نیا سماج۔ کوئی عمل ضائع نہیں جاتا۔ محنت برباد نہیں ہوتی۔ نیکیوں کی قدر بہر حال ہوتی ہے۔ فرق صرف آج اور کل کا ہے۔ اور یہ فرق شعور کی تبدیلیوں کا ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

درد و غم میں اگر نشاط کار کی لذت نہ ہو تو جینا بیکار۔ لیکن یہ بات ہر ایک کے بس کی نہیں۔ اس کے لئے فلسفی کی نگاہ اور شاعر کا دل چاہیئے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کا آخر اور انیسویں صدی کے شروع کا ہندوستان ایک بھیانک تصویر ہے۔ نہ مستحکم سلطنت' نہ منظم حکومت' انتشار و طوائف الملوکی۔ نراجی مزاج اور افراتفری۔ زوال پذیر سماج آخری سسکیاں لے رہا تھا۔

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

ان حالات میں کسی انسان کے زندہ رہنے کی صورت کیا ہو سکتی تھی؟ سرکشی' صوفی گری' دانش وری' شاعری۔ زمانے کے رنگ کو دیکھ کر غالب کے انسان نے قلم کو علم بنالیا۔ اس لئے کہ بزرگوں کے شکست خوردہ

نیزوں کی نوکیں گھس چکی تھیں۔ قلم کو علم بنا لینے کی وجہ ظہوری، نظیری، فیضی اور امیر خسرو کی مثالیں بھی تھیں تو ساتھ ساتھ اس کا احساس انفرادیت اور حوصلہ مندی بھی اور انسان کو راہ دکھانا بھی۔

بیاورید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لیکن اس آزادہ روی اور علوئے ہمت کے لئے میدان تنگ تھا۔ غالب کے انسان کی عربدہ جوئی وسعتوں کی متلاشی تھی۔ مگر حالات کا اقتضاء اس کے حوصلوں کے مطابق نہ تھا۔

یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا
عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

نہ بند ہے تشنگی شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

یاس وامید کی اس کشمکش میں غالب کے انسان نے حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی۔ یعنی زندگی سے محبت خواہ وہ کتنی ہی زار و نزار کیوں نہ ہو۔ اور اگر وہ اس حقیقت پسندی کی راہ اختیار نہ کرتے تو اپنی انفرادیت اور حوصلہ مندی دونوں ختم کر دیتے۔ پھر ادب کا طالب علم ان کو ذوق اور مومن کے ہم عصر

سے زیادہ وقعت نہ دیتا۔ "عربدہ جوئی" کا تقاضا بصارت نہیں بلکہ بصیرت تھا۔

"مرنے میں جینے کا مزہ لینا" "ہوس کو نشاط کار" میں تبدیل کر دینا' غالب کے انسان ہی کا کام تھا۔ جو حقیقتوں سے انکار بھی نہ کرے۔ اور پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر بھی نکال لائے۔ جس کے لئے زخم تیغ دلکشا بن جائے۔ وہ زندگی کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہو سکتا۔ وہ انسان کو سپردگی سے باز رکھنے کو فریضہ گردانتا ہے۔

زیزداں غم آمد دل افروز من
چراغ شب و اختر روز من

الم پسندی غالب کے انسان کے فلسفہ جمالیات کا وہ حسین نقطہ ہے جہاں شگفتگی بھی ملتی ہے اور ندرت بھی۔

وگرز ایمنی راہ و قرب کعبہ زحظ
مرا کہ ناقہ زرفتار ماند و پاخفتت

لیکن اس کے بعد بھی یہ اس کا مزاج تھا کہ وہ چوٹ کھا کر ہنس لیتا ہے۔ وہ غیر مطمئن زندگی کا قائل تو نہیں تھا۔ مگر اسے غیر مطمئن زندگی گزارنا پڑی۔ اس کے حوصلوں کی وسعت اور ماحول کی تنگی۔ مزاج کی رجائیت اور حالات کی ابتری۔ یہ ایک ایسا تضاد تھا جسے غالب کا انسان زندگی

بھر حل نہ کر سکا۔ اسی کا نتیجہ وہ حرماں نصیبی اور الم پسندی ہے جو اس کی ساری شخصیت اور فن پر چھائی ہوئی ہے۔

سوزم از حرماں مے با آنکہ آبم در سبو است
تاچہ میکردم اگر بخت سکندر داشتم

''حرمان مے'' اور ''شغل سمندر'' میں نہ یاس ہے اور نہ قنوطیت۔ نہ احساس پستی ہے اور نہ اقرار نکبت۔ بلکہ حوصلہ مندی اور عزم ہے جو شخص ''طبع بلبل'' ''شغل سمندر'' ''حرماں مے'' اور ''بخت سکندر'' کا ذکر ایک ہی لے اور ایک ہی لہجے میں کر سکتا ہے۔ وہ کتنی پر شکوہ شخصیت کا مالک ہو گا۔ ''دہیرم'' ''شاعرم'' ''بذلہ سنجم'' ''آزاد رو'' ''رند مشرب'' ''ندیم''۔ کتنی پر کشش شخصیت ہے۔ ایسی شخصیت جو ہر پست و بلند کو پیس کر اپنے ہی سانچے میں ڈھال لینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود مہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہگزر پاشیم
مے آوریم وقدح درمیاں بگردانیم

''آسمان کو گردش رطل گراں کا پابند بنانے والا''۔ ''کلیم کی میزبانی سے انکار کرنے والا''۔ ''خلیل کی مہمانی کا منکر'' ''راستے میں گلاب کی بارش کرنے والا'' سماج اور زمانے کی پابندیوں کا مزاق اڑانے والا۔ صرف ایک باغی انسان نہیں بلکہ پر شکوہ و پر کشش شخصیت کا مالک ہے اس کی عظمت کا راز یہی ہے کہ اس نے ذاتی غم کو کائناتی غم بنا لیا تھا حقیقت یہ ہے کہ کوئی فنکار اس وقت تک عظیم ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ یہ راستہ اختیار نہ کرے۔ فردوسی کا المیہ اس کا ذاتی غم بھی تھا۔ جس کا نتیجہ وہ ہجو ہے جو ''شاہنامہ'' کے ختم ہونے کے بعد اس نے محمود کو بھیجا تھا۔ مگر یہاں اس کا ذاتی غم ذاتی سے زیادہ صفاتی اور سماجی ہے۔

بے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اس ذاتی غم کا دوسرا رخ اس کے شاہنامے کا وہ حصہ ہے جہاں تاریخ آویزش و کشمکش سے گزرتی ہے۔ یعنی غم زندگی کا وہ جزو جہاں سے اس کے ملک کی تاریخ بدل رہی تھی۔ اور وہ خود بدل رہا تھا۔ افتخار ذات اور افتخار ملک۔ اور پھر اس کی شکست خوردگی یا شکستگی۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدہ است کار

کہ تخت کیاں را کند آرزو

تفو بر تفوائے چرخ گردوں تفو

غالب کے انسان کا الم پسند ہونا ان کی زندگی کا کیف و کم تھا۔ شاید ہی اس کے دور کے کسی فنکار کو اتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہوں۔ یہ تکلیفیں جسمانی بھی تھیں۔ روحانی بھی تھیں اور مادی و اقتصادی بھی۔ "حبس بے جا" کے واقعے کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے جو اس کے لئے تمام زندگی سوہان روح بنا رہا۔ تو پنشن کی اجرائی کے لئے دہلی سے کلکتے کا سفر انہوں نے کیا۔ مقروض وہ ہوئے۔ دوسروں کی خوشامدیں انہیں کرنا پڑیں۔ اپنے علم و فضل پر رکیک حملے انہیں برداشت کرنا پڑے۔ کلکتے کے قیام کے دوران قتیل اور اس کے شاگردوں کا ہنگامہ اور وہ بھی اس کتاب پر جو آنے والی نسلوں کو اغلاط زبان و بیان سے آگاہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہو۔ خالص علمی بات تھی۔ یہ واقعہ بجائے خود علم و ادب کی دنیا کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہے کہ غالب کے انسان کو معذرت کرنا پڑی۔ جو کہ اس کے علم و فضل اور انانیت پر تازیانہ تھا۔ لیکن اس نے یہ سب کچھ اس لئے برداشت نہیں کیا کہ وہ مرنجاں مرنج تھے بلکہ اس لئے کہ مخالفین کو بات کرنے کا سلیقہ آجائے۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ذاتی غم کو اس طرح برداشت کرے

اور اس میں ایسا فن بھر دے کہ وہ آفاقی ہو جائے۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

سودا اپنی طباعی اور خوش مزاجی کے لئے مشہور ہیں۔ مگر وہ بھی یا تو حالات کے سامنے سپر انداختہ ہیں یا جزبز۔

فکر معاش یاد بتاں عشق رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

کیفیت مزاج (mood) کی یہ تبدیلی نہ تو زندگی کا حرکی عمل ہے اور نہ متوازن سماجی فعل۔ غم زندگی کا ایک تسلسل ہے۔ بسیط اور محیط۔ اس میں "تھا" اور "ہوگا" تینوں زمانے شامل ہیں۔ غالب کے انسان کا غم "ہے" کی دنیا تک محدود نہیں۔ اس کی الم پسندی "تھا" سے عبارت ہے۔ "تھا" جو زندگی کا تسلسل ہے اور ماضی، حال اور مستقبل سب کو ایک دائرے میں سمیٹ لیتا ہے۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
یعنی یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

غالب کے انسان کے پاس غم کی ایک تاریخ تھی۔ زمانے کا نشیب و فراز، سماجی ڈھانچے کا شکست وریخت سے دوچار ہونا، غیر واضح مستقبل، مبہم

امیدیں، تذبذب و انتشار، اس لئے غالب کے انسان کے یہاں ہر جگہ پیچ و خم ہیں۔

یہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

"شریک غالب" کا تصور غالب کے انسان کے لئے حقیقت ہے۔ یہ "شریک غالب" ہی تھا جو اس سے سب کچھ کرا رہا تھا۔

"اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اس مہینے میں ہو جائے۔
اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے
تیاری ہو رہے اور شوال میں رسم نکاح عمل میں آئے۔
اور چونکہ اس ماہ میں در فیض باز اور سال انگریزی کا آغاز وہ
پچیس روپے مہینے زبان مبارک سے نکلا ہے۔ جنوری سے
جاری ہو جائے تو گویا دونوں جہان مل گئے۔"

یہ حسین علی خاں زین العابدین مرحوم کے صاحبزادے تھے جن کو مرزا نے گود لیا تھا۔ بیوی کی خواہش سہرا دیکھنے کی تھی۔ اس کے لئے یہ لجاجت ہے۔ یہ

خط نواب رامپور کے نام ہے۔ اس خط کے سر فہرست پر جو شعر ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

روز روزہ است و روز ناپید است
غفلت ابر و شدت سرما است

لفظ و معنی کو اگر ٹٹولا جائے تو یہاں معلوم نہیں کتنے رستے ہوئے ناسور ملیں گے۔ تکلیف دہ حالات پر ہنس لینا خواہ ذاتی ہوں یا صفاتی' رجائیت کی فتح اور قنوطیت کی شکست نہیں تو اور کیا ہے۔

در ہیچ نسخہ معنی لفظ امید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آئندہ و گذشتہ تمنائے و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بہ ہرجا نوشتہ ایم

یہی "کاشکے" غالب کے انسان کی سب سے بڑی دین ہے۔ جو مایوس کن حالات میں بھی نشاط کار اور نشاط سخن کا حوصلہ بخشتی ہے۔ یہ "کاشکے" نہ تو ماضی مطلق ہے اور نہ مستقبل بعید۔ بلکہ حال اور استقبال کے درمیان (Idealism) کی ایک کڑی ہے۔ زندگی آئیڈل کے سہارے ہی بسر ہوتی ہے۔ آئیڈل ہر مفکر اور فنکار کے پاس ہوتا ہے۔ کہیں واضح اور کہیں غیر واضح۔ کارل مارکس کے پاس آئیڈل واضح تھا۔ تو روسو کے پاس غیر واضح۔

ٹیگور کے پاس غیر واضح تو اقبالؒ کے پاس واضح۔ اقبالؒ کی نظر میں اگر عالم نو کی سحر بے حجاب تھی۔ تو اس لئے کہ حالات کا رخ واضح تھا۔ غالب کے انسان کے سامنے زندگی کا فکری نظام شکست کھا چکا تھا۔ حالات کا رخ واضح نہیں تھا۔ ''داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع باقی'' رہ گئی تھی مگر وہ بھی ''خاموش۔'' گویا غالب کے انسان کو زندگی کا خواب رات کے اندھیرے میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔ لیکن یہ ''کاشکے'' اس کا سرمایہ حیات تھا۔ جہاں تمنا و حسرت بھی تھی۔ اور آنے والی زندگی کا اعلان بھی۔ اس میں شکست کی رنگ آمیزی بھی ہے اور لہجے کی بلند آہنگی بھی۔ یہ نوا نہ افسردہ ہے، نہ مردہ اور نہ بے ذوق۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

وہ اس بات کا قائل تھا کہ زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ سکون و ثبات زندگی کی نفی ہے۔

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

''وہ ننگ پیری ہے جوانی میری'' کہنے کے بعد بھی وہ جوانی کی قدر کرتا ہے۔ بنسی دھر کے والد کے نام خط میں لکھتے ہیں۔ ''ایک کٹھرہ کشمیری

والا کہلاتا تھا۔ اس کٹہرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑاتا تھا۔۔۔ میں سیر و سیاحت کو عزیز رکھتا ہوں۔ بنارس خوب شہر ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اور ''چراغ دیر'' اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔'' لیکن جب قوی مضمحل ہو گئے اور زندگی سے بیزار ہو گیا۔ تب بھی۔

نہ لائے شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی

کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

''تمنا'' ''آرزو'' ''حسرت'' ایک طرف شرح ہنگامہ ہستی ہیں۔ تو دوسری طرف سبب ''بال کشائی'' یہ نظریہ زندگی کو قوت عطا کرتا ہے۔ جو ''رہبر قطرہ بہ دریا'' بن کر موج گل' موج شفیق' موج شراب' اور موج صبا' تخلیق کرتا ہے۔ اور اس تخلیق مزاج سے ''طوفان طرب'' کی نمود ہوتی ہے اور فلسفہ طرب ہی آخر میں زندگی کی حقیقتوں کا راز بن جاتا ہے۔ زندگی سے دل کھول کر لطف لینا جب تک کہ قویٰ ساتھ دیں۔ اور جب قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جائے تو پھر زندگی اور سماج کی حقیقتوں پر غور کرنا۔ گویا جذبے کے ساتھ تفکر اور تفکر کے ساتھ جذبے کی آمیزش ضروری ہے۔ یہ ہے غالب کے انسان کے فلسفہ جمالیات اور فلسفہ غم کا بنیادی پہلو۔ مزاج و شخصیت کی اسی خصوصیت نے اس کی شاعری کو جاندار اور اس کی الم انگیزی

کو اس حد تک حسین بنا دیا کہ ''اس کا ذکر'' بھی پسند آنے لگا۔

غالب کے انسان کا ایک اور حسین پہلو اس کی جرات فکر اور انفرادیت ہے۔ ''مثنوی ابر گہر بار'' اس کا نتیجہ ہے۔ مادیت اور روحانیت کی کشمکش بہت دلچسپ ہے۔ زندگی تضاد و تقابل کا شکار ہے۔ ایک طرف زندگی کا ہمہ گیر نغمہ ہے۔ غم ہجر و ذوق وصال کی کشمکش ہے۔ بوسہ و سوگند، آسودگی و نا آسودگی، ہائے ہو، شور و شر، تو دوسری طرف افسردگی، اضمحلال، سکوت اور جمود، نہ وہ تاک جھانک، نہ فریب و گریز کی کیفیت۔ کون اس دنیا میں مطمئن ہو گا جہاں ناؤ نوش کی بھی گنجائش نہ ہو۔ غالب کا انسان وہ ''نگاہ آشنا'' چاہتا تھا جس سے ''ذوق تماشا'' کو تسکین مل سکے۔ وہ ''نگاہ بے حجابانہ'' کے ساتھ ''روزن دیوار'' کا بھی قائل تھا۔ ان کے یہاں ''ذوق تماشہ'' ''آئینہ رو، روزن دیوار تینوں کا وجود ضروری تھا۔

غالب کا انسان اگر آج کے دور میں زندہ ہوتا تو اس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا۔ مگر اس کی اس انفرادیت اور جرات فکر میں غم اور غم میں زندگی کا خروش ہے۔ اس کے غموں کا یہ خروش اس تشکیک و تادیب کا رہین منت ہے جو اس کی فکر کا بنیادی ستون ہے۔ جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے۔ تشکیک اگر حد سے بڑھ جائے تو یاسیت کی حدیں چھو لیتی ہے۔ ''عالم تمام حلقہ دام خیال'' نظر آتا ہے۔ جس چیز نے انہیں یاسیت کی طرف جانے سے روک لیا

وہ ان کی فطری بذلہ سنجی ‘انفرادیت اور جرات فکر تھی۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیاو چہ دیں

ان کے اس میلان طبع کے ساتھ دوسری چیز جو ان کے انسان کو جبریت اور عدمیت "Nihilism" کی طرف لے جانے سے روک رہی تھی وہ اس کا عقیدہ وحدت الوجود تھا۔ تصوف کی گرفت اس دور میں اتنی مضبوط تھی کہ پورا ماحول اسی میں جکڑا ہوا تھا۔ رند مشربی اور تصوف ہم معنی لفظ بن گئے تھے۔ اسی لئے غالب کے انسان کے یہاں بادہ خوری کے باوصف‘ دعوئے تصوف کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ چیز اس کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ توحید کا اعتراف اور کیش ترک رسوم پر فخر‘ خفیہ و اعلانیہ اس کا اظہار‘ ان کی جرات فکر اور جرات عمل کا ثبوت ہے۔

یہ مسائل تصوف‘ یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر غالب کے انسان کا تصوف ہمہ از اوست کا قائل نہ تھا بلکہ ہمہ اوست۔ لا موجود۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘موثر فی الوجود الا اللہ۔ ہمہ اوست کے اس تصور نے جہاں ان میں بالغ نظری پیدا کی وہاں آفاقیت کے عناصر بھی۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ماتیں مٹ کر اجزائے ایمان بن سکتی ہیں تو زندگی کا انفرادی نقطہ نظر زندگی کا اجتماعی شعور بھی بن سکتا ہے۔ فرد اور جماعت اگر مترادف الفاظ نہیں تو ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں۔ اقبالؒ نے سچ کہا۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

آج اس دور جمہوریت میں اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون اہم ہے اور کتنا۔۔۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ اجتماعی شعور فرد کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ فرد کی انا' آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے تھی شکلیں بدل گئی ہیں۔ مگر اصل روح وہی ہے۔ غالب کے دور میں اجتماعی شعور اور اجتماعی فلسفے کی تلاش بیکار ہے۔ وہ دور دراصل فرد کی صلاحیتوں کا دور تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجتماعی تصور ناپید تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ فرد اکثر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے پاس زندگی کی تعمیر کا سامان موجود ہو۔ غالب کے انسان کے پاس صالح اقدار حیات موجود ہیں۔ وہ دور انتشار میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے مایوس نہ تھا۔ پسپائیوں نے اسے تھکایا نہیں۔ بلکہ اگر غالب کے انسان کی پوری زندگی پر نظر کی جائے جس میں پنشن کی اجرائی کے لئے کلکتہ کی دوڑ اور وہ قصیدے اور عرضیاں بھی شامل ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً گورنر جنرل کلکتہ' ریزیڈنٹ دہلی' سکریٹری سرکار

انگلیشہ اور ملکہ وکٹوریہ کو روانہ کیں تو ہر قدم پر جہد عمل کی روح جاگتی اور بلند سے بلند تر حقیقت کی تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنگ ظرفیٔ منصور نہیں

غالب کا انسان فرد کی انا کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ وہ بندگی میں بھی آزاد و خود بین تھا۔ اور اس حد تک کہ "الٹے پھر آئے اگر در کعبہ وانہ ہوا" اس لئے جب وہ فرد کی انا کو مجروح ہوتے ہوئے دیکھتا تو اس کا لہجہ انتہائی پرسوز ہو جاتا۔ یوسف مرزا کے نام خط ایک پرسوز مرثیہ 'ایک نغمہ جانگداز' ایک نالہ دردانگیز ہے۔

"جوانمرد دونوں قیدوں سے بہ یک وقت چھوٹ گیا۔ نہ قید فرنگ رہی نہ قید حیات۔"

قید فرنگ نے غالب کے انسان کی "انا" کو بھی مجروح کیا تھا۔ یہ زخم اس کے لئے زخم دلکشا نہ تھا بلکہ وہ تیر نیم کش جس کی خلش وہ ہمیشہ محسوس کرتا رہا۔ لیکن آرزومندی کے جذبے نے پھر سنبھال لیا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غالب کے انسان کے لئے اس لئے اہم نہیں تھا کہ اس کے سب چاہنے والے مر گئے بلکہ اس لئے کہ "اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی"۔ حسن پرستی بوالہوسی میں بدل گئی۔۔۔۔ غالب کے انسان کی

عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ ہمیں بہترین تخلیق میں مدد دیتا ہے۔ کوئی بھلا اپنی ذات کو بھلا کر کب تک جماعت کو یاد رکھ سکتا ہے آج بھی مجبور فرد کے لئے جو معاشرے کی چکی میں پس رہا ہے غالب کے انسان کا پیغام نغمہ بیداری ہے۔

بوادی کہ درآں خضر را عصا خفتست
بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پاخفتست

غالب کے انسان کے نغموں کی جھنکار خوابیدہ انسانوں کو جگا سکتی ہے یا نہیں مگر اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی للکار وہ قوت ہے جو آج بھی کم مرتبہ اور بدنصیب انسانوں کا قیمتی سرمایہ ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم

فلک کو گردش رطل گراں کا پابند کر لینا' بلند بینی اور بلند آہنگی کے علاوہ امید افزاء اور خوشگوار خواب ہے۔ غالب کے انسان کی عظمت کا راز تشکیک و تذبذب' آفاقیت و انسان دوستی' شوخی و ظرافت' بذلہ سنجی و متانت' فرد کی اہمیت اور اس کی انانیت کے اظہار و حفاظت میں ہے۔

یہ وہ تہذیبی ورثہ ہے جو ہر دور میں انسان کو قوت دیتا ہے۔ جب تک انسان اپنی ہستی کو محسوس کرتا رہے گا اور نظام جبر سے ٹکراتا رہے گا۔

اس وقت تک غالب کے انسان کا نغمہ حیات دلوں کو گرماتا رہے گا۔

اس لئے کہ زندگی کا تصور جامد نہیں نامی (Dialcelie) ہے۔ وہ آج بھی کشمکش اور تضاد کا شکار ہے۔ کل کے "بت کافر" آج کے "بتان آذری" ہے۔۔۔۔۔ زندگی ہمیشہ سے بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے انسان آج چاند کو مسخر کر چکا ہے۔ مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے لیکن زمین پر تاریکی، نفرت اور زرگری کی قوتوں نے جو ڈیرا ڈالا ہے۔ اسے کیسے اور کس طرح کاٹا جائے؟ کوئی منظم تحریک سامنے نہیں۔ جو غم کا مداوا، قلب کا سکون اور رنج و غم کو مندمل کر سکے۔ "وحشت" میں گھر جانے کے بعد غالب کے انسان کی نگاہیں اس انسان پر جم جاتی ہیں جو اس کے نزدیک جبر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا 'اشارہ' ہے۔ اس لئے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا قلم یوں رقص کرنے لگتا ہے۔۔۔۔

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

یا

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ بجز تیرے کوئی جس کا خریدار نہیں

یا

تیرے در کیلئے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

غالب کی یہ تمام خواہشیں، رنجشیں اور تمنائیں اس انسان کو خوبصورت بنانے کی جانب اشارہ ہیں جو تیرگی کے ہاتھوں کل بھی لہولہان تھا اور آج بھی ہے۔

میر انیس

میر انیسؔ

میر انیس کا تصور انسان کیا ہے ؟ کائنات میں اس کا مقام کیا ہے ؟ حیات انسانی کے متعلق اس کے نظریات کیا ہیں ؟ ان نظریات و تصوارت کا سر چشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے ؟ حریت و آزادی کے متعلق اس کی سوچ کیا ہے ؟ داخلی و خارجی حقائق کے ساتھ اس کی فکری ہم آہنگی کہاں تک ہے ؟ یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات ہیں جو میر انیس کے انسان کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان زندگی ہی کے خزانے سے اپنے جیب و دامن کو بھرتا ہے۔ لیکن زندگی کو سمجھنے اور اسے کام میں لانے کی صلاحیت ہر انسان میں نہیں ہوتی۔ کوئی زندگی کے نہاں خانے میں اتر کر تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے اور کوئی سانسوں کا جنازہ بن کر زمین پر بوجھ بن جاتا ہے۔ زندگی کو سمجھنے اور اس کی کشمکش سے نتائج اخذ کرنے پر ہی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار ہے۔

انیس کے انسان نے زندگی کو کس طرح برتا اور پرکھا ہے اس کا سراغ پانے کے لئے اس انسان کے شعور تک رسائی حاصل کرنا اور ذہنی

سیاحت میں اس کا ہم سفر بننا لازم ہے کیونکہ "مینے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" ہر عہد میں انسان کی روح تک پہنچنے اور اس کے شاہکار کو پرکھنے کی کسوٹی رہا ہے۔ ترسیل و ابلاغ کی یہی وہ قوت ہے جو ہر بڑے انسانی واقعے سے ہمیں قریب کر دیتی ہے۔

میر انیس کا مستقل موضوع واقعہ کربلا اور اس کا انسان ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس واقعے سے کیوں متاثر ہوئے؟ اس کی غالباً دو وجہیں ہیں۔ (اول) میر انیس نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے مورث اعلیٰ میر امامی عہد شاہجہاں میں دہلی آئے۔ اور وہیں بس گئے۔ تقریباً چار پشتیں وہیں گزاریں۔ علمی ذوق کی بنا پر وہ تمام مہذب حلقوں میں مقبول ہوئے۔ جس وقت دہلی اجڑی۔ اس وقت میر امامی کے پوتے میر غلام حسین ضاحک نے فیض آباد کا رخ کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ جس وقت دار لسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا۔ اس وقت میر انیس کے دادا میر حسن اور والد میر مستحسن خلیق بھی لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ اس وقت علم و دانش کا مرکز تھا۔ شاہان اودھ اعلیٰ تہذیبی اقدار کے دلدادہ اور واقعہ کربلا کی سحر خیز فکر پر سو جان سے فدا تھے۔ مرثیہ کا فن عروج پر تھا۔ میر انیس کا اس ماحول سے متاثر ہونا لازم تھا۔

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے واقعے نے ہندوستان کی

بساط الٹ دی تھی۔ زمین کو لہو کا غسل دیا گیا تھا۔ ۲۷ ہزار مسلمان ایک رات میں پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے۔ ذہنوں کی لوئیں کتر دی گئیں تھیں۔ سروں پر گرم سلاخوں کے شامیانے تان دیئے گئے تھے۔ فکر نے سوچنے سے انکار کر دیا تھا۔ شکست، سپردگی، خوف وہراس، بس یہی کل کائنات تھی۔ اجتماعی فکر نے دم توڑ دیا تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم غلام ہو جاتی ہے تو اس کے خیالات دو طرح کے مضامین کی جانب راغب ہوتے ہیں۔ (اول) پارینہ داستانوں کو دہرانا، عظمت گذشتہ کا نوحہ پڑھنا، خیال عیش رفتہ سے دل بہلانا۔ (دوم) ''دنیا مایا جال ہے۔'' ''زندگی بلبلا ہے۔ پانی کا'' ''ترک لذات'' ''ترک دنیا'' فقر و درویشی کی داستانیں دہرانا۔ یہ سب اس لئے کہ جب دنیاوی حالات بدلنے پر قدرت نہیں ہوتی تو انسان ایسے ہی خیالات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ادب میں کم وبیش انہیں خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو عوام کی جذباتی ضروریات پورا کرنے اور انہیں خواب غفلت میں پڑے رکھنے کے لئے لکھی گئی تھیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعے سے پہلے ہمارے بیشتر شعراء کا تعلق دربار سے تھا۔ دربار کی فضا مصنوعی اور زندگی سے دور تھی۔ شہنشاہان وقت متلون مزاج تھے۔ ان کے ''انداز'' کا اثر ادب بھی قبول کر رہا تھا۔ گھسے پٹے مضامین

اور فرسودہ خیالات کی بہتات تھی۔ سفاکی و خون ریزی' جوڑ توڑ' رشک و حسد' عداوتیں' خنجر' تلوار' شاعری کے مستقل موضوعات تھے۔ عوام سے رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مضامین کے صحرا میں دور تک آب نہیں تھا۔ اس دور میں میر انیس کا یہ منفرد پہلو ہے کہ انہوں نے دربار سے کبھی رشتہ نہیں جوڑا۔

رہی یہ بات کہ ۱۸۵۷ء کے واقعے کو انہوں نے کس نگاہ سے دیکھا۔ اس کے متعلق زیادہ معلومات موجود نہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اس واقعے نے ان کے ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ قوم کی ٹھکرائی ہوئی خودداری اور حمیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک انقلابی نظریئے اور شعلگیٔ فکر و عمل سے مزین انسان کی ضرورت ضرور محسوس کی۔ ایک ایسا انسان جس کی فکر ہر عہد کے شعور میں لہو کی طرح گردش کرنے لگے۔ اور اس کی بصیرت سے سینکڑوں بصیرت کے چراغ جل اٹھیں۔

میر انیس کو شکست خوردہ' ہزیمت یافتہ اور بھٹکی ہوئی قوم کو جگانے کے لئے واقعہ کربلا کا انسان نظر آیا۔ جسے انہوں نے صدیوں کے انسانی جدو جہد کے معجزوں کا عطر پایا۔ میر صاحب نے محسوس کیا کہ کربلا احساس غم دل کا صلہ ہے۔ ایک ایسا احساس جو ستمگری کے ناخداؤں نے ہر دور میں 'لہو' کی صورت میں انسان کو دیا ہے۔ ان کی نظر میں کربلا ایک ایسا نظریاتی

ہتھیار تھا جو زر و جواہر کے نیچے دبی ہوئی سلب شدہ قوت احساس کو واپس دلاتا اور چھینی ہوئی جرأت اظہار کو علم بنانے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ میر انیس کا مرثیہ جبر کے خلاف انقلاب کی آواز بن گیا جس نے حریت و آزادی کی تحریکات اور بلند ترین معیار حق و صداقت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی پوری شاعری اسی نظریئے کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔

ادب میں نظریئے کی اصطلاح کے متعلق آج بھی بہت سی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ علامہ شبلی کو چھوڑ کر کئی نقادان فن، جن کے ذہن کی سیڑھیاں کمزور ہیں انہوں نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ''میر انیس کا کلام محض رونے رلانے کے لئے ہے۔'' اور وہ ایک ''مخصوص فرقے تک'' محدود ہے۔ اس لئے ادب کے نگار خانے میں نمایاں طور پر سجانے کا مستحق نہیں۔

اس کجی فکر کی بنیادی وجہیں دراصل دو ہیں (اول) مرثیے کا عروج ایران میں شاہان صفویہ کے دور میں ہوا۔ (دوم) یہ کہ ہندوستان میں اس کی سرپرستی گولکنڈہ کے علاوہ شاہان اودھ نے کی۔ چنانچہ اسی بنا پر ایک مخصوص مکتب فکر نے مرثیے کی صنف کو مطعون گردانا۔ اور اس پر گلباری کی جگہ سنگ باری کی۔

رہی بات نظریئے کی تو یہ حقیقت کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ دنیا کے تمام اعلیٰ ادب کی تہہ میں کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور کار فرما ہے۔ یعنی شعر

کا تجربہ ہو یا کسی اور صنف کا۔ وہ کسی نہ کسی نظریئے سے وابستہ ضرور ہوتا ہے۔ اب تک کوئی شاعر اور فنکار ایسا پیدا نہیں ہوا' جس کے ذہن میں اپنے گردوپیش کے متعلق کوئی تاثر یا نظریہ نہ ہو۔ مثلاً ایسا کوئی شخص نہیں جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ دنیا جہل' تاریکی' نفرت اور زرگری کی طرف جاری ہے۔ یا امن' محبت' پیار اور اعلیٰ اقدار کی جانب۔ اور اس کا قبلہ درست کرنے کے لئے کونسی راہ اختیار کی جائے۔

یا کس تاریخی واقعے نے انسانی ذہن پر کس قسم کے اثرات مرتب کئے ہیں؟ اور اس واقعے کی تہہ میں کونسا "نظریہ" کارفرما ہے؟ پھر اس نظریے کی اہمیت کیا ہے؟ فلسفہ تاریخ و تہذیب میں اسے کیوں اہمیت حاصل ہے؟ کیونکہ عصر جدید کے تمام علوم و افکار "کیوں" کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ 'کیا' بھی 'کیوں' ہی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح سارا ادبی سرمایہ مصنوعی اور لفظی اعتبار سے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

شاعر چونکہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے اس کی انفرادیت پر اجتماعیت کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ ایک طرح کا تاریخی جبر ہر تغیر کے پردے میں کارفرما ہے۔ آج تغیر و تبدل اور نظریئے کا جواب "اتفاق" نہیں بلکہ اسباب و علل کے تجزیے کا متقاضی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس "نظریے" پر اعتقاد بھی ضرور ہو۔ لیکن ہر واقعے اور ہر شاہکار کی تہہ میں اپنے اپنے زاویہ

نگاہ سے کسی نہ کسی نظریئے کی کارفرمائی ہوتی ضرور ہے۔

اسی بناء پر ہر عہد کا عظیم ادب کسی نہ کسی نظریئے سے وابستہ رہا ہے۔ ویاس کی "مہابھارت" والمیکی اور تلی داس کی "رامائن" یونانی شاعر ہومر کی 'illied' ایلیڈ اور اوڈیسی' اطالوی نظم 'ڈیوائن کامیڈی Divine Comedy ملٹن کی Paradise Lost فردوسی کا 'شاہنامہ' غرضیکہ تمام شاہکاروں کی تہہ میں کسی نہ کسی نظریئے کی جھلک ضرور دیکھی جاسکتی ہے۔

عصر حاضر کے عظیم فلسفی و شاعر علامہ اقبالؒ کی شاعری نظریہ اسلام کی حیات آفرینی کا پیغام ہے جس کی تشریح انہوں نے اپنی معرکتہ الارا کتاب "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں کی ہے۔ جس کا تذکرہ آگے کیا جائے گا۔ اقبالؒ کے سلسلہ فکر کا مجموعی اثر اسلام کا وہ نظریہ ہے جو جھلسے ہوئے ہونٹوں کو آب حیات' اور گدائے راہ کو "شکوہ قیصری" عطا کرتا ہے۔ تاکہ 'بلال' کے آنسوؤں کے دائرے میں موتیوں کی دکان سجائی جاسکے۔

گرمی وہ برق تیری جان ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دست موسیٰ پر
تپش ز شعلہ گرفتند و بردل توزدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل توزدند

ان حقائق کی روشنی میں اگر میر انیس کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کے چہرے پر اٹی ہوئی گرد کو صاف کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنا چاہیئے۔

میر انیس نے محسوس کیا کہ ان کا انسان لاکھوں چھوٹے بڑے روشن دائروں پر محیط ہے جو سیاہی کے لئے انگارہ اور اجالے کے لئے نور تن ہے۔ جس کے سینکڑوں رنگ اور ہر رنگ میں ایک ابدی تازگی ہے۔ یاقوتی' قرمزی' بنفشی' انگوری' فیروزی' کتھی' بادامی' سرمئی۔

امیر انیس کے اس انسان کا پہلا رنگ حب الوطنی یعنی اپنی زمین سے چاہت کا ہے۔ زمین جس کا ذرہ ذرہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی اس کی محبت میں سرشار' پھولوں سے لدی ڈال ہے۔

دوسرا رنگ کنبے کی محبت کا ہے جو اس کی نس نس میں چنبیلی کے پھول کی خوشبو کی طرح بسا ہوا ہے۔ ایسی خوشبو جو اس کے وجود کو تازگی و شگفتگی' شادابی و رعنائی بخش رہا ہے۔

تیسرا رنگ رفیقوں' دوستوں اور احباب سے ذہنی رفاقت' ذہنی لگاوٹ اور ذہنی ہمدردی کا ہے۔

اور چوتھا رنگ انسان و انسانیت سے محبت کا ہے ایسی گہری محبت کا جہاں انسان کا رنگ جلد بدن' رنگ و سوز گلو' رنگ لخت جگر کچھ بھی ہو۔ وہ

شیریں ہو یا تلخ ہو یا تیز ہو وہ ہر انسان کے لئے شبنم ہے۔ فوارے کی طرح بلند۔ لیکن زمین کے درد سے جڑا۔ اسے شاداب کرتا ہوا۔

شخصیت کی تعمیر و تشکیل گوناں گوں رنگوں سے مرتب ہے۔ ان میں سے سب سے گہرا رنگ خاندان کے ماحول کا ہوتا ہے۔ گھرانے کی فضاء طبقاتی روابط، نظام اخلاق، فکری زاویہ نگاہ۔ اس کے علاوہ گرد و پیش کے حالات، تغیر و تبدل کے مختلف النوع واقعات شخصیت کے گرد ہالہ بناتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں یہ سعادت میر انیس کو ہی حاصل ہے کہ انہوں نے واقعہ کربلا کا صرف مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس عہد کے حالات و واقعات کا تجزیہ بھی کیا اور اپنے ممدوح کے خاندان، اس کے طور طریقوں اور فکری جہتوں سے بھی ادب کو روشناس کرایا۔ میر انیس کے "انسان" نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اور اس کے خرد کے اکھوے پھوٹے۔ اس وقت اس گھرانے کے سرپرست کا مقام کیا تھا۔ وہ میر انیس کی زبانی سنیئے :۔

جز ذات خدا سب پہ محمدؐ کے ہیں احساں اس شاہ کے ہیں خوان کرم پر سبھی مہماں
وہ اصل ہے اور فرع سب عالم امکاں تھا خلق دو عالم سے یہی مطلب یزداں

باطن میں بھی فیض اس کا ہے ظاہر بھی وہی ہے
اول بھی سبھوں سے وہی آخر بھی وہی ہے

اللہ نے دی تھی اسے کونین کی شاہی امی تھے پہ تھا دل مین بھرا راز الٰہی
دی سنگ نے اس شہہ کی رسالت پہ گواہی اشجار بھی اعزاز سے اس کے ہوئے راہی
دی مردوں کو جاں سبز کیا خشک شجر کو
دو کر دیا انگلی کے اشارے سے قمر کو

جن لوگوں سے فرماتے تھے یہ احمد مختار اے قوم نہ اصنام کو سجدہ کرو زنہار
جز حق کے نہیں کوئی پرستش کا سزاوار قائل ہو خدا کے کلمے کا کرو اقرار
وہ کہتے تھے ساحر ہے جواب اس کا نہ دو تم
کذاب ہے کاذب کی نصیحت نہ سنو تم

تھا خار کوئی راہ میں اس گل کی بچھاتا اور سنگ دلی سے کوئی پتھر تھا لگاتا
دانائے زماں کو کوئی دیوانہ بناتا اس چاند پہ کوٹھے سے کوئی خاک گراتا
پر خوں نظر آتا تھا سرد روئے مبارک
بھر جاتے تھے سب خاک میں گیسوئے مبارک

کفار قریش آپ کے تھے درپے ایذا دوبار بہم ہو کے سبھوں نے کیا نرغا
گردن مین رو ڈال کے اس زور سے کھینچا جو صدمے سے دم گھٹ گیا محبوب خدا کا
راحت نہ ملی بادشاہ جن و بشر کو
ہر اک نے کسا قتل محمد پہ کمر کو

میر انیس اپنے محبوب "انسان" کے ماں اور باپ کا تعارف یوں کراتے ہیں :

یہ صادق الایمان ہے یہ ہے زاہد و عابد یہ وہ ہے رہا راہ خدا میں جو مجاہد

سجدہ نہ کیا اور کو۔ جز خالق واحد پیدا ہوا جب خلق میں اس کا ہوں میں شاہد

اک عشق ازل سے ہے اسے ذات خدا سے

ہم نام خدا ہے یہ عنایات خدا سے

کعبے میں قدم مہر نبوت پر دھرا ہے بے شک حق و باطل کو جدا اس نے کیا ہے

خالق نے اسے رتبہ معراج دیا ہے یہ صاحب لولاک کے کاندھے پہ چڑھا ہے

زوجہ اسے زہرا سی ہے خالق نے عطا کی

وہ میرا کلیجہ ہے تو یہ جان ہے میری

میں کرتا ہوں تعظیم یہ ہے اس کی بزرگی ہے گو کہ وہ مخدومہ عالم میری بیٹی

با خط جلی عرش پہ نام اس کا رقم ہے اس نور نظر پر مرے حق کا یہ کرم ہے

ایسے ماں باپ کی آغوش میں بچے نے آنکھ کھولی ہے میر انیس اسے یوں دیکھتے ہیں :

دکھلانے لگے نور تجلی درد و دیوار ناگاہ در حجرہ ہوا مطلع الانوار

فرزند مبارک تمہیں یا حیدر کرار اسماء نے علی سے یہ کہا دوڑ کے اک بار

اسپند کرو فاطمہ کے ماں جبیں پر

فرزند نہیں چاند۔ یہ اترا ہے زمیں پر

مژدہ یہ سنا احمد مختار نے جس دم　　پس شکر کے سجدے کو گرے قبلہ عالم
آئے طرف خانہ زہرا خوش و خرم　　فرمایا مبارک پسر اے ثانی مریم
چہرہ مجھے دکھلا دو مرے نور نظر کا
ٹکڑا ہے یہ فرزند محمدؐ کے جگر کا

پس اتنے میں نازل ہوئے جبرئیل خوش انجام　　کی عرض کہ فرماتا ہے یہ خالق علام
پیارا ہے نہایت ہمیں زہرا کا گل اندام　　یا ختم الرسل ہم نے حسین اس کا رکھا نام
یہ حسن میں سردار حسینان زمن ہے
مشتق تو ہے احسان سے۔ تفسیر حسن ہے

نانا اور نواسے کے رشتے کے حسن سے ادب کا دامن اب تک خالی تھا لیکن ماہر نفسیات میر انیس نے بچے کی معصومیت اور دلفریبی کے بناؤ کو یوں محسوس کیا۔ اور نانا کی نواسوں کی نازبرداری کا انداز اس طرح دیکھا۔ صحن مسجد میں نواسے کھیل رہے ہیں۔ نانا نے ایک کا دہن دوسرے کا گلا چوم لیا ہے۔ میر انیس نے اپنے محبوب کی معصومانہ اداؤں کو اپنے معجز نما قلم سے یوں سمیٹ لیا :

شبیر چاہتے تھے کہ چومیں میرے بھی لب　　پر کچھ لبوں کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب　　جھک جھک کے چومتے تھے گلا سید عرب
بھائی کو دیکھ کر جو حسن مسکراتے تھے
غیرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اٹھے حسینؑ زانوائے احمد سے خشمگیں غصہ سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
رخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

بیت الشرف میں آئے جو شبیر نامدار کرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار
چلائیں کہہ کے فاطمہ زہراء جگر فگار ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشک بار
تجھ کو رلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا
قربان جاؤں میں تجھے کس نے خفا کیا

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو سمجھی میں کچھ حسن سے خفا ہو کے آئے ہو
بولے حسین ہم تو ہیں اس بات پر خفا نانا نے چومے بھائی کے لب اور میرا گلا
تم اماں جان منہ کو تو سونگھو میرے ذرا
کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رلاتے ہیں

ماں کا بیٹے کو آبدیدہ دیکھ کر مضطرب و پریشان ہو جانا فطری عمل ہے۔ ماں نے بیٹے کو گود میں اٹھایا ہے۔ شکایت کرنے باپ کے پاس گئی ہیں۔ میر انیس اس پہلو کی نزاکتوں کو یوں بیان کرتے ہیں :

یہ کہہ کے اوڑھ لی سر پر نور پر ردا — موزے پہن کے گود میں شبیر کو لیا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبند مصطفیٰؐ — فضہ نے بڑھ کے بوذر و سلمان کو دی ندا

پیش نبی حسین کو گود میں لاتی ہیں
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہ مسجد میں آتی ہیں

اللہ رے آمد آمد زہرا کا بندوبست — ساتوں فلک تھے اوج شرافت سے اسکے پست
احمد کے گرد و پیش سے اٹھے خدا پرست — انسان تو کیا ملک کو نہ تھی قدرت نشت

آئیں تو شاد شاد رسول زمن ہوئے
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوئے

میر انیس کا معجز نما قلم گھر میں ایک طرف بچے کی ناز برداریاں دیکھ رہا تھا لیکن دوسری طرف اس گھرانے کی سلگتی ہوئی مفلسی بھی ان کے پیش نظر تھی۔ جس کا نقشہ وہ یوں پیش کرتا ہے :

لاتے جو مزد آب کشی شیر ذوالجلال
تب جو منگا کے پیستی تھی وہ نکو خصال
جزاک ردائے کہنہ نہ تھی دوسری ردا
اس میں بھی لیف خرما کے پیوند جابجا
بستر سے تھا کبھی نہ تن پاک آشنا
فرش زمیں تھا خواب گہہ بنت مصطفا
دنیا میں جیتے جی کبھی راحت نہیں ملی

فاقوں میں گر ملی بھی تو نان جویں ملی

میر انیس نے اپنے ان اشعار کے ذریعے نہ صرف اس گھرانے کی فضا سے ادب کو متعارف کرایابلکہ اس پہلو پر بھی نگاہ ڈالی کہ ان کے انسان کے شعور کا ارتقاء کیسے اور کس ماحول میں ہوا۔ محبت و محنت کی فضا نے اسے کس طرح کوہکن بنا دیا۔ ایسا کوہکن جو قول و عمل کی ہم آہنگی کے ساتھ ایک نئی پیکر شیریں تراشنے کو تھا۔

میر انیس کے انسان نے یہ بھی دیکھا کہ نانا کی وفات کے بعد ان کے حیات آفریں نظریئے کو باسی دیگ سمجھ کر کس طرح الٹ دیا گیا۔ جہل نے توڑے اور فتوؤں کے بل پر ''نیا نظریہ'' اپنے طبقے کے مفادات کو سامنے رکھ کر کس طرح گڑھا۔ گمرہی کی رسی کس طرح ڈھیلی ہوئی۔ ہری گھاس کیسے چری جانے لگی۔ انسانی گھاٹ پر قبضہ کیسے جمایا گیا۔ اقتدار کو طول دینے کے لئے عسکری قوت کا سہارا کیونکر لیا گیا۔ ایک طرف اجالے اور تین طرف اندھیرے کا نظام پھر نافذ ہوا۔ اسے چلانے کے لئے دو اصول وضع کئے گئے۔ (اول) جو حکومت سے تعاون کرے گا اس کو عہدہ دیا جائے گا۔ عہدہ جتنا بڑھتا گیا اتنی ہی گردنیں جھکتی گئیں۔ (دوئم) جو انکار کرے گا۔ اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔ جہل کی بے لگام طاقت نے عالموں کی سانسیں چرالیں۔ چاندی کے بھنور نے زمین کی حرارت چھین لی۔ مکر نے

انسانی محبت کا لبادہ پہنا۔ محمود 'حرم' میں شاہی انداز سے آیا۔ 'ایاز' سڑک پر کھڑا رہا تکتا رہا۔

ایسے سخت گیر حالات میں ایک گروہ صاحبان اقتدار کے مفادات سے رشتہ جوڑے ضمیر کا سودا کر رہا تھا۔ زر و جواہر کے تلے قوت احساس کو سلب اور جرات اظہار کو پابند سلاسل کر رہا تھا۔

دوسرا گروہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر سپر انداخت محراب و منبر میں بند تسبیح کی دانہ شماری میں 'نجات' کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔

تیسرا گروہ کہہ رہا تھا 'حاکم ظل اللہ ہے۔ حکومت سے ٹکرانا ہمارا منصب نہیں۔ بس اللہ ہو۔ بس 'اللہ ہو۔ چوتھا گروہ کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس اسلحہ نہیں۔ توپیں اور بندوق نہیں۔ اتنی بڑی عسکری قوت سے ٹکرانا عقلمندی نہیں۔ ہم ظلم کے مخالف ہیں۔ لیکن خاموش۔

ایسے سنگین حالات میں میر انیس نے دیکھا کہ ان کا انسان ''اقرار اطاعت جبر کی شریعت'' کو بدل کر ''تازہ شریعت انکار'' عطا کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ تاریخ ''انکار'' تاریخی تسلسل کا حصہ ہے۔ 'انکار' جو ستم کی دہلیز پر ہمیشہ لہولہان ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خون دل زدگاں بے آسرا و یتیم نہیں ہوتا۔ وہ رعب مسند اور مفتی دین کی آہنی کلائی کو اپنی ناتواں کلائی اور ادراک و آگہی کی قوت سے مروڑ دیتا ہے۔ خسروی کی پیشانی کو عرق ریز کر

دیتا ہے۔

میر انیس کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ ان کا انسان ''انکار'' کی حفاظت کے لئے قافلہ حق ترتیب دے رہا تھا۔ وطن چھوڑ رہا تھا۔ قافلے میں بہنوں کا غرور، بچوں کی معصوم مسکراہٹ، جوانوں کا عزم، دوستوں ورفیقوں کی تجربات کی سچائی، مشاہدے کی وسعت سب شامل ہیں۔ وطن کو چھوڑتے ہوئے وطن اور مٹی کی محبت سینکڑوں کروٹیں لے رہی تھی :

برپا ہے مدینے میں تلاطم کئی دن سے ہے راحت و آرام و طلب گم کئی دن سے
گھر گھر میں ہے اک شور تظلم کئی دن سے منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گزری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

یثرب کے زن و مرد ہیں سب بے خور و بے خواب شبیر کی فرقت کی کسی دل کو نہیں تاب
ہم سائے ہیں ماتم ہے۔ بکا کرتے ہیں احباب غل ہے کہ مدینے میں خوشی اب ہوئی نایاب
اس شاہ میں خوبو تھی شہہ عقدہ کشا کی
اب کون خبر راتوں کو لے گا غربا کی؟

خلقت کا ہے مجمع در دولت پہ سحر سے جو آتا ہے روتا ہوا وہ آتا ہے گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدہ تر سے چھپ جائے گا اب فاطمہ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اجالا نہ رہے گا

ہیں جمع محلے کی جو سب بیبیاں گھر میں　　در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گزر میں
اک حشر ہے ناموس شہر جن و بشر میں　　تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جسطرح کہ مر جاتا ہے کوئی

جھیلوں میں بھی نہروں میں بھی سب خشک ہے پانی　　سنتے ہیں یہ ہر وارد و صادر کی زبانی
کس طرح جئیں گے اسد اللہ کے جانی　　اس فصل میں ہوتی ہے فزوں تشنہ دہانی
تو نسا ہوا بچہ کبھی جاں بر نہیں ہوتا
جب خشک ہوا پھول' تو پھر تر نہیں ہوتا

میر انیس کے نفسیات کا مطالعہ بتا رہا تھا کہ انسان یادوں سے پیچھا چھڑانے کی خواہ کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کرے لیکن کسی نہ کسی عنوان کوئی نہ کوئی یاد اس کا تعاقب ضرور کرتی ہے۔ پرانی یادوں کے دھندلے نقوش اس کے ذہن میں ابھرنا ضرور شروع ہو جاتے ہیں۔ کسی شئے کو چھوڑتے ہوئے یہ جذبہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ میر انیس کی نگاہ اپنے انسان کے اس پہلو پر ہے:

کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہوئے مرا آنا　　رخصت کو ابھی قبر پیمبر پہ ہے جانا
اس مرقد انور کو ہے آنکھوں سے لگانا　　اماں کی لحد پر بھی ہے ابھی اشک بہانا
آخر تو لئے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبر حسن سے

میر انیس یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ وطن چھوڑتے ہوئے ایک اور یاد جو نیزے کی انی بن کر ان کے انسان کے سینے میں گڑ چکی تھی وہ تھی بیمار بیٹی کی یاد۔ جسے سفر میں لے جانا ممکن نہیں تھا۔ جبکہ بیٹی کرب کے عالم سے یوں گزر رہی تھی اور بابا سے یوں فریاد کر رہی تھی :

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

سن کے یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا' سخن لب پہ یہ لائے کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے

جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوش خو اور سورہ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو آنکھوں کو تو کھولا' پر ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا میرے پاس آئے ہیں اماں

شہہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ میں کہہ نہیں سکتا' مجھے در پیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ

ناچار یہ فرقت کے الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

محبت کے مختلف مدارج ہیں (اول) انس یعنی مزاج کی ہم آہنگی۔ (دوئم) حب جب تعلقات مزید استوار ہونے لگتے ہیں۔ (سوئم) عشق، جب فریقین کے درمیان شدید وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ (چہارم) دلہ۔ جب عشق محبت کی اعلیٰ ترین سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ آنکھ کی وساطت سے جو محبت ہوتی ہے۔ اس کو عشق کہتے ہیں۔ اس کا تعلق محبوب کے رعنائی خدوخال سے ہوتا ہے عشق کا الاؤ حالات کی سرد مہری اور ماہ و سال کے چھینٹوں سے بجھ جاتا ہے۔ لیکن عقیدت اور دلہ کی آگ تا حیات جلتی رہتی ہے۔ شعور کے ذریعے جو محبت پیدا ہوتی ہے اسے عقیدت کہتے ہیں۔ اس کا تعلق انسانی صفات کے اعتراف کمال سے ہوتا ہے۔

میر انیس کے انسان کی دوسری سطح، اور دوسرا رنگ رفقاء و انصار سے محبت کا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا انسان چھوٹے سے چھوٹے فرد میں بھی جو بظاہر بلوریں شیشے کی طرح ٹھنڈا نظر آتا ہے۔ وہ اس میں بھی اپنی سچی و پر خلوص محبت کی کرنیں ڈال کر چھپی ہوئی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ اسی لئے رفقاء و انصار کا دل اس کی جانب اس طرح بہہ رہا تھا جیسے ندی کا پانی ترائی کی جانب۔ اسی لئے اس کے ہر دوست و ساتھی کا اس انسان کے کوچے میں قدم رکھنا طواف کعبہ تھا۔ چہرہ کا دیدار نگاہوں کی عبادت تھا۔ اور اس کے ساتھ جہاد کرنا حج اکبر تھا۔ میر انیس نے اس رنگ کو یوں نکھار دیا۔

تھے جمع ادھر بھی در مولیٰ پہ موالی ماتھوں پہ نشاں سجدے کے چہروں پہ بحالی
دل صبر سے معمور، شکم کینے سے خالی کیا حلم تھا کیا زہد تھا کیا ہمت عالی
ہوتے تھے فدا نام پہ فرزند نبی کے
وہ عاشق صادق تھے حسین ابن علی کے

باندھے ہوئے عمامے سروں پر وہ خوش اطوار تھے شاہ کے قدموں پہ فدا ہونے کو تیار
نورانی عباؤں کے تلے جنگ کے ہتھیار رخ غیرت خورشید جبیں مطلع انوار
فولاد کے سینے تھے تو شیروں کے جگر تھے
خود تیغ تھے اور سبط پیمبر کے سپر تھے

جس جا پہ گرے سبط پیمبر کا پسینہ خوں اپنا گرادیں یہ وہاں گر ہو قرینہ
تیغ آئے جو سر پر تو سپر کردیں یہ سینہ آتش میں گریں، حکم جو دیں شاہ مدینہ
تنہا شہہ مظلوم کا مدفن نہیں چھوڑا
مر کر بھی تو شبیر کا دامن نہیں چھوڑا

میر انیس نے یہ بھی دیکھا کہ صرف خورد ہی نہیں بلکہ بزرگوں کے لئے بھی ان کا انسان کرروروں حسین یادوں کی جھرمٹ 'اور کردار کی پاکیزگی کا دوسرا نام تھا۔ اس پر جان نثار کرنا جیب ابن مظاہر جیسے بزرگ کے لئے بھی وجہ افتخار تھا۔

آنکھوں سے شیر نر کی جلالت تھی آشکار　　گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار　　رومال پھاڑ کر انہیں باندھا تھا استوار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہوگیا ہاتھوں کو چوم کے

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہ نامدار　　یہ کس لئے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اتر پڑوں گا نہ ہوگے اگر سوار　　کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہہ نظر بہ روئے تو کردم جواں شدم

لیکن بے حد اصرار اور یہ فرمانے پر کہ "اچھا تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم" حبیب ابن مظاہر گھوڑے پر یہ کہتے ہوئے سوار ہو جاتے ہیں

ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے
"کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے"

انسان صدیوں سے راہبر کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ اس لئے وہ ہر آن ریل کی پٹڑی کی طرح لفظ و عمل بدلتا رہتا ہے۔ لیکن میر انیس یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا انسان ایک ایسا رہبر ہے جس سے جڑا رہنا ہر شخص کے لئے ذریعہ بیداری نشاط ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہر رفیق و دوست' آنکھوں کی راہ سے اس کے نظریہ کی صداقت' اس کے عملی و تخلیقی کارناموں کو دیکھ رہا تھا۔ نتیجے میں ان کے الفاظ و عمل اس طرح حرکت میں ہے :

پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار
مولا نے غازیوں کو دیا حکم کار زار
نکلے وغا کو قبلہ عالم کے جاں نثار
جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار
ہوں گے، نہ ہیں، نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے
سب جان دے کے حق نمک سے ادا ہوئے

حُر و بریر و وہب و عمیر فلک مقام
وہ مسلم ابن عوسجہ عرش احتشام
سعد و زہیر و قین و جیب خستہ کام
وہ شیر جس کا بو عمر نہلشی تھا نام
جس غول پہ جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو الٹ گیا

ہر دور کا ابو جہل اپنے اقتدار کے نشے میں پانی، ہوا، اور روشنی پر قبضہ کرنا اپنا حق گردانتا ہے۔ وہ انسان کو ذہنی و جسمانی پیاسا اس لئے رکھتا ہے تاکہ گردنیں اس کے حضور جھکی رہیں۔ لیکن امن، محبت و پیار انسان کو سیراب کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جس کی انلگیوں کے پوروں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ اور سارے سماج کو سیراب کرتی ہے۔ حاکم وقت کے حکم کے تحت حُر نے میر انیس کے انسان کا راستہ روک لیا ہے۔ لیکن پیاس کی شدت ہے۔ اس لئے پانی کا طالب گار ہے :۔

منہ دیکھ کے فرمانے لگے شاہ خوش اقبال کیا وجہ جو تم لوگ ہو سب مضطرب الحال

تب عرض یہ کی حُر نے کہ اے فاطمہ کے لال بے تاب ہیں سب ماہی بے آب کی تمثال

آہوں کا دھواں اٹھتا ہے پیاسوں کے جگر سے

قطرہ نہیں پانی کا ملا تین پہر سے

یہ سنتے ہی بے تاب ہوئے سبط پیمبر دیکھا رخ عباس کو اشک آنکھوں میں بھر کر

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں سب پیاس سے مضطر جو ساتھ ہے پانی ابھی منگواؤ برادر

بھیا! کمر اب کھولیو' پیاس ان کی بجھا کے

میں کانپ رہا ہوں کہ یہ بندے ہیں خدا کے

آہستہ یہ کی عرض کہ "اے کل کے مددگار" پر مصلحتاً عرض یہ کرتا ہے دل افگار

کیا طاقت و قدرت جو کروں حکم میں تکرار اطفال ہیں ساتھ آپ کے 'یا سید ابرار!

مولا! کئی فرسخ ابھی جانا ہے یہاں سے

مانگیں گے وہ پانی تو وہ آئے گا کہاں سے

فرمایا مرے سر کی قسم' کچھ نہ کہو اب میری یہی مرضی ہے کہ سیراب ہوں یہ سب

انسان کا انساں سے روا ہوتا ہے مطلب مر جائیں مسلماں! یہ گوارا ہے مجھے کب

میں مالک کوثر ہوں تردد تمہیں کیا ہے

پیاس ان کی بجھا دو' مرے بچوں کا خدا ہے

مصروف ہوا خود پسر ساقی کوثر　　پیاسوں کو عطا ہونے لگے پانی کے ساغر
تقسیم ادھر کرتے تھے عباس دلاور　　پیاسوں کو ادھر دیتے تھے پانی علی اکبر

ہر لب پہ سخائے شہ والا کا بیاں تھا
دریا کرم ساقی کوثر کا رواں تھا

انسان کی تشنگی اور سوز و ساز سے رشتہ استوار کرنا انسانی عمل کے محرک ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو باقی کائنات سے ممیّز کرتی ہے۔ ہر خوبصورت عمل ایک جہان تازہ آباد کرتا ہے۔ ہر نئے عمل سے انسان ارتقاء کی نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ انسانی عظمت اور کردار کی بلندی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ دائرہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ زمان و مکاں کی حدود و قیود انسان کے ارتقاء میں حائل ہونے سے عاجز ہیں۔ میر انیس نے دیکھا کہ ان کے اجالا صفت انسان کی ایک ہلکی سی رمق نے اندھیرے کو کاٹ دیا۔ روشنی نے حُر کو یہ کہنے پر مجبور کردیا :

"عمل خیر سے بہکا نہ مجھے۔ او ابلیس"۔

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار　　سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آئے اک بار
تن کے دیکھا طرف فوج امام ابرار　　پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار

غل ہوا سید والا کا ولی جاتا ہے
لو طرف دار حسین ابن علی جاتا ہے

یاں ہوئے علم امامت سے شہہ دیں آگاہ   ہنس کے عباسؑ سے فرمایا کہ "اے غیرت ماہ"
میرے لشکر کی طرف ہے رخِ حُرِ ذی جاہ   سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ

جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
میرا مہماں' مرا عاشق' مرے پاس آتا ہے

اشتناشہ یہ کیا حر نے جو بادیدہ نم   آگیا جوش میں اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہ امم   حر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اُس دم

شکر کر سبط رسول الثقلین آتے ہیں
لے بہادر تیرے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حر پکارا "یا انی انت وامی یا شاہ   قابل عفو نہ تھے بندہ عاصم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے یہ راہ!   سب ہے صدقہ انہیں قدموں کا خدا ہے آگاہ

مہر ذرے پہ جو ہو' نیر تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

کون مقداد تھے سلمان وابوذر تھے کون ؟   آپ فرمائیں کہ عمار دلاور تھے کون ؟
شور عالم میں جو ہے مالک اشتر تھے کون ؟   اے خداوند جہاں حضرت قنبر تھے کون ؟

انہیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے
اسی سرکار کے خلعت سے سرافراز ہوئے

شہہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب   دے کسی شخص کو بندے میں یہ مقدور ہے کب ؟
اس سبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب   وہی منعم' وہی محسن' وہی رازق' وہی سب

اپنے کیسے سے نہ دام' اور نہ درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

خاندان انسانی زندگی میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ شخصیت کی نیو ہوتا ہے جس پر انسان کھڑا ہوتا ہے۔ افراد خاندان بال و پر ہوتے ہیں جن سے طاقت و توانائی حاصل کر کے وہ اڑتا ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ خاندان سے کٹ کر انسان تنہا ہو جاتا ہے۔ اس دور میں سوز و ساز' درد و داغ کی کیفیت کا بنیادی پہلو تنہائی کا احساس ہے اور اسی احساس سے بندھی ہوئی کسی ایسے ہمدم و ہم راز کی آرزو ہے جو اس کے دکھ کو سکھ میں بدل دے۔ ''ابن مریم'' ہونا کافی نہیں ہے۔ انسان کو تلاش و جستجو ہے اس انسان کی جو ''چارہ ساز ہو غم گسار'' ہو۔ خاندان اسی شکست و آرزو کا مداوا تلاش کرتا ہے۔ میر انیس کے انسان کی تیسری سطح اور رنگت کنبے کی محبت ہے جس سے وہ سرشار ہے۔ اس محبت کے کروروں پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو میں ایک ابدی تازگی ہے۔ بہن بھائی۔ ایک دوسرے کی سینکڑوں حسین یادوں کی جھرمٹ ہوتے ہیں۔ بہن بھائی کی محبت سے بوجھل بھائی کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لئے بے چین ہے۔ بھائی ایک اعلیٰ مقصد کی للک اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی لگن میں آمادہ سفر ہے۔ بہن ساتھ ساتھ ہے۔ ادھر بھائی کی رتبہ شناسی کا یہ عالم ہے۔ میر انیس اس پہلو کو یوں رقم کرتے ہیں :

آ پہنچی جو ناقے کے قریں دختر حیدر   خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشہ چادر   تھے پردہ محمل کو اٹھائے علی اکبر

فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

بھائی کی اولاد اپنی اولاد سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ سفر میں چاند نظر آیا ہے پھوپھی کے دل میں بھتیجے کا چہرہ دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھی ہے۔ میر انیس اس خوبصورت پہلو کو یوں دکھاتے ہیں :

یہ سنتے ہی فضہ علی اکبر کو پکاری   لو دیکھ چکیں چاند ید اللہ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری   آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں داری

آئے تو رخ اکبر ذی قدر کو دیکھوں
شکل مہ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

بھتیجے نے اذان دی ہے فضا مہک اٹھی ہے۔ پھوپھی کا چہرہ دمک اٹھا ہے۔

زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار
صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

لوگوں کو اپنی خوشی میں شامل کرنا یہ انسانی فطرت ہے۔ میر انیس نے اس جذبے کی عکاسی کی ہے :

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے   وہ لوزعی کہ جس کی طلاقت دلوں کو بھائے
عین الاکمال سے تجھے بچے خدا بچائے   دو دن میں ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے

غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نور عین پر

بھائی نے کربلا کی زمین پر قدم اتارا ہے۔ صحرا کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہے۔ سامنے ترائی نظر آئی ہے۔ بھائی نے کنبے کے افراد پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ جملے ادا کیے ہیں۔ "دیکھو! تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا۔" بیٹے اور بھائی دریا کو دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں۔ جی چاہا کہ فوراً اسی مقام پر خیمہ بپا کر دیں۔ لیکن گھرانے کی تہذیب یہ ہے کہ فیصلہ بڑے بھائی کا آخری ہے۔ میر انیس محبت کے ان پہلوؤں کو کس طرح سمیٹ رہے ہیں۔

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نامور   خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر
کچھ سوچ کر امام دو عالم نے یہ کہا   زینب جہاں کہیں وہیں خیمے کرو بپا

پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباس باوفا
جاکر قریب محمل زینب یہ دی صدا

حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا   برپا کہاں ہو خیمہ اقدس حضور کا
بولی یہ سن کے دختر خاتون روزگار   اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار

خشکی ہو یا ترائی، چمن ہو کہ سبزہ زار
ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار

مختار کائنات کے تم نور عین ہو — اترو وہاں' جہاں مرے بھائی کو چین ہو

بھائی سے پہلے اس زمین کی سنی ہے بہت صفت — ہے وہ امام' واقف اسرار شش جہت

جو جو مسن ہیں ان سے بھی لازم ہے مصلحت

صدقے گئی جیب سے بھی کرلو مشورت

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو — بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

عاقل ہو تم تو نام خدا' اے علی کے لال — مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال

دریافت کرلو پہلے کسی سے یہاں کا حال

داری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال

گوشہ ملے ہمیں' نہ فضا ہو' نہ سیر ہو

اب تو یہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو

یہاں دو باتیں میر انیس کے سامنے' قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ بہن کا مرتبہ بھائی کی نظر میں ماں کے برابر ہے۔ "ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم" دوسری بات یہ کہ اس محبت میں ذہنی ہم آہنگی کا بھی عنصر شامل ہے۔ بات اگر صرف ماں ہی تک ہوتی تو کہا جاتا کہ چونکہ بہن بزرگ خاندان ہیں اسلئے وہ جو کچھ کہیں اس پر عمل کیا جائے لیکن یہاں بات کہنے کا انداز مختلف ہے "کچھ سوچ کر امام دو عالم" نے یہ فیصلہ دیا کہ "زینب جہاں کہیں وہیں خیمے بپا کر دو" بھائی کا یہ جملہ بہن کی پختگی نظر پر دلیل ہے۔ اور یہ دلیل اور زیادہ مستحکم اس وقت ہوتی ہے جب بہن چھوٹے بھائی کی دلجوئی یہ کہتے ہوئے کرتی ہے کہ تم

"عاقل ہو" لیکن مشورے میں حبیب کو ضرور شامل کرلو کیونکہ "بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردوبدل نہ ہو" چنانچہ ہوا وہی جس کا بہن کو ڈر تھا۔ اوہر نیزے بڑھا کے اشقیا بڑھے۔ دوسری جانب چھوٹے بھائی عباس نے قبضے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چاہتے ہیں کہ اسی لمحے دریا کو چھین لیں۔ کہ اچانک صدا بلند ہوئی :

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے وہ غصہ ہے شیر کو

یہ آواز بہن کے کانوں تک پہنچتی ہے نتیجے پر چونکہ نگاہ ہے اس لئے بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے آواز دیتی ہیں :

ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسد کبریا کے لال
غربت پہ ابن فاطمہ کی تم کرو خیال
قربان ہوگئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصے کو تھام لو

پھر انتہائی بردباری سے بھائی کو یوں سمجھاتی ہیں :

لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر — محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر
عباس تم تو ساقی کوثر کے ہو پسر — یہ نہر کیا ہے جس کے لئے رنج اس قدر

مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے
جنگل مجھے پسند ہے، میں گزری ترائی سے

کرسی سے جلد اٹھ کے پکارے شہہ انام ‏ بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
غربت زدوں پہ چاہیے اللہ کا کرم ‏ پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمہیں قسم

ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں
پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلہ نہیں

میر انیس کے نزدیک یہاں بہن بھائی کی محبت کے دو پہلو قابل غور ہیں۔(اول) بھائی کے غصے کو یہ کہتے ہوئے فرو کرنا ''نہر جیسی چھوٹی چیز پر جنگ کرنا تمہارے مرتبے کے منافی ہے کیونکہ تم ''ساقی کوثر کے لال ہو۔'' ۔۔۔۔۔دوسری بات یہ کہ بہن کی معاملہ فہمی پر بھائی کو اس قدر اعتماد ہے کہ چھوٹے بھائی کو بھتیجی کی قسم دے کر فوراً واپس بلا لیتے ہیں۔

ماموں اور بھانجوں کی محبت انسان کی جذباتی زندگی میں پیوست ہیں۔ جنہیں جذبات و احساسات کی جو ئبار سینچتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ماں کی خواہش ہے کہ بچے ماموں پر فدا ہو جائیں لیکن یہاں نقشہ کچھ بدلا ہوا ہے۔ میر انیس اسے کیسے دیکھ رہے ہیں۔

زینب نے سنی جب یہ خبر شاہ امم سے ‏ مسلم کے پسر خوب لڑے فوج ستم سے
دل ہل گیا رنگ اڑ گیا افراط الم سے ‏ آنسو رخ انور پہ بہے دیدہ نم سے

کام آتا تھا جو سن کے خجل ہوتی تھی زینب
فرزندوں کا منہ تکتی تھی اور روتی تھی زینب

ماموں نے انہیں دل کی طرح گود میں پالا آقا کی رفاقت سے ہوئی قدر دو بالا
کیا دل میں نہیں ان کے دلائے شبہ والا پروان چڑھے نام خدا ہوش سنبھالا

بیٹا ہو، بھتیجا ہو، غنی ہو کہ گدا ہو
مجھ کو تو وہ پیارا ہے جو بھائی پہ فدا ہو

خیمے میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہیں مادر
ساتھ اپنے انہیں لے کے گئیں بانوئے مضطر کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انہیں خواہر

یہ نور نظر لائق الطاف و عطا ہیں
تقصیر ہوئی کیا کہ حضور ان سے خفا ہیں

یہاں یہ پہلو بھی ملحوظ خاطر رہے کہ بچے ڈر اور خوف کی وجہ سے ماں کے پاس براہ راست نہیں گئے ہیں بلکہ اپنا سفارشی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ بچوں کے رویے سے ماں خفا ہے۔ اس لئے کہ وہ کنبے کے سامنے سبکی محسوس کر رہی ہیں۔

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیہ شبیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحب شمشیر

انصاف تو کیجئے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہے

حمزہ کون تھا اور کون حسن قیس تجلی ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلی
کیونکر ہو بھلا مادر مضطر کو تسلی مقتل ہیں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلی

آفت میں یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

تو ڑ آئے ہوں خیبر کے کسی در کو تو کہہ دیں تا کوفہ بھگا آئیں ہوں لشکر کو تو کہہ دیں
مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں خوشنود کیا ہوئے جو مادر کو تو کہہ دیں

چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لے کر پھرے ہیں
کیا شام کے سردار کا سر لے کر پھرے ہیں

ماموں کو علم عطا ہوا ہے۔ بھانجے للچائی ہوئی نظروں سے علم کو دیکھتے ہیں۔ لیکن خاموش ہیں۔ ماں نے یہ منظر دیکھا ہے مسئلے کی تہہ تک پہنچ گئی ہیں۔ میر انیس اس نازک پہلو سے کس طرح گزرتے ہیں :۔

پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر سمجھیں علم نہ ملنے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر

بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں

پروا ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال
ہاں آج ہم کو بھول گئے شاہ خوش خصال اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال

کیا ورثہ دار جعفر طیار ہم نہ تھے
اس عہدہ جلیل کے حق دار ہم نہ تھے

بہن بڑے بھائی پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے بے چین ہے۔ لیکن بھائی کو بہن کی تنہائی کا خیال ستا رہا ہے۔ عجیب ذہنی کشمکش سے دوچار ہیں۔ میر انیس اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں :

بنت علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر　　رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہ بحر و بر
اک جان ہے بس اور یہ دوپارہ جگر　　مایہ مری یہی، یہی دولت، یہی ہے زر

پالا ہو جس نے اس کا نہ کچھ حق ادا کروں
ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

خواہش ہے کہ بھائی ہدیہ قبول کر لیں۔ اس لئے اپنی دلیل کو مستحکم بناتے ہوئے کہتی ہیں :

"دونوں دلاسا دینے کو آبیٹھے میرے پاس"
آکر کہا کہ آپ کو اتنا ہے کیوں ہراس
آسان کچھ ہے قتل شہنشاہ حق شناس
بچے ہیں شیر کے جنہیں بچہ سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

دوسری جانب بھتیجا چچا پر جان نثار کرنے کیلئے مضطرب ہے۔ کیفیت یہ ہے :

فرزند حسن روتے ہوئے خیمے میں آئے
مادر نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے
اب جاتے ہیں مرنے کو پھوپھی جان کے جائے
ان بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے

جوان بیٹا باپ کی زینب ہوتا ہے۔ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی میں باپ اپنی ڈھیتی ہوئی زندگی کا سہارا ڈھونڈ ھتا ہے۔ بیٹا باپ سے رن میں جانے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ باپ کی روح بے چین ہے۔ بیٹے کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کی ہمت نہیں ہے۔ میر انیس کا معجز نما قلم جذبات کی عکاسی اس طرح کرتا ہے:

دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دم قرار
بیکس پھوپھی کو گھر میں تمہارا ہے انتظار
دیکھ آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار
چھوٹی بہن پکارتی ہے تم کو بار بار
ہم کوئی دم میں آب دم تیغ پیتے ہیں
یہ چند دم تمہارے بھروسے پہ جیتے ہیں

بیٹا جام شہادت نوش کرتا ہے۔ بیوی کی تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔ ماں کو بیٹے کی خبر کیسے اور کس طرح سنائی جائے! کشمکش سے ذہن دوچار ہے۔ میر انیس جذبات کو یوں تصویر بنا کر دکھاتے ہیں:

پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے، دیکھا اِدھر اُدھر
رخصت کی بھی حضور کی ان کو نہیں خبر
فضہ نے عرض کی کہ ادھر پیٹتی ہیں سر
لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے
چلیئے ذرا کہ کام اب ان کا تمام ہے

دیکھا کہ غش ہیں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
روتے ہوئے گئے جو وہاں شاہ خوش خصال
اے شہربانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال
شبیر بیٹھ کر یہ پکارے بہ صد ملال
سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دکھ دکھائے ہیں
صاحب۔ اٹھو۔ ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سن کر صدا حسین کی چونکی وہ نوحہ گر   کی عرض سر جھکا کے قدم پر بہ چشم تر
تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر   صاحب کہاں ہے منتوں والا میرا پسر

ایسے نہیں، جو دکھ میں جدا ہوں وہ باپ سے
اپنے مرادوں والے کو میں لوں گی آپ سے

شوہر نے بیوی کے سامنے سر جھکا دیا ہے جواب میں بس اتنا ہی کہہ سکے :

جاتے ہیں ہم وہیں کہ جہاں ہے وہ لالہ فام   دے دو، جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سن کر یہ ذکر ہوش میں آئی وہ تشنہ کام   سمجھی کہ گھر تباہ ہوا، اب چلے امام

خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اجڑ کے تخت الٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دل فگار   اے ابن فاطمہ، یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار   بیٹھے کہاں پہ بے کس و غمگین و سوگوار

کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جایئے
صاحب کوئی جگہ مجھے بتلا کے جایئے

بھائی بھائی کا قوت بازو ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے گرمی و حرارت اور حسن و رعنائی ملتی ہے۔ "چھوٹے سے چاہیئے کہ محبت زیاد ہو" کی بنا پر بڑا بھائی ہر عنوان نازبرداری کرنا فریضہ گردانتا ہے۔ چنانچہ یہاں بڑے بھائی کی محبت کا انداز یہ ہے کہ :

جب سے خدا کے شیر نے چھوڑا جہان کو
پالا ہے میں نے گود میں اس نوجوان کو
بازو یہی ہے ہاتھ یہی تن کی جاں یہی
قوت یہی، عصا یہی، تاب و تواں یہی
بھائی یہی، سپر یہی، راحت نشاں یہی
خادم یہی، شفیق یہی، مہرباں یہی
پانی پلائے جب یہ بہشتی تو پیتے ہیں
ہم تو اسی جواں کے سہارے سے جیتے ہیں

دوسری جانب چھوٹے بھائی کا یہ عالم کہ:

جس دن سے مدینے سے چلے سید الابرار عباس نے کھولے نہ کمر سے کبھی ہتھیار
راتوں کو بھی مانند قمر رہتے تھے بیدار اور خیمے کے چوگرد پھرا کرتے تھے ہشیار
عاشق تھے زبس دوش محمد کے مکیں کے
اس پردے میں ہوتے تھے تصدق شہہ دیں کے

فرماتے تھے یہ بارگاہ شاہ امم ہے کیا رتبے میں کچھ خانہ کعبہ سے یہ کم ہے
اس گھر کا ادب فرض ہے جب تک مرا دم ہے گرد آوری خیمہ نہیں یہ طوف حرم ہے
یہ احمد مختار کے پیاروں کا مکاں ہے
یہ عرش معلیٰ کے ستاروں کا مکاں ہے

جہل و تاریکی کی قوتوں کو ہمیشہ یہ گمان رہا ہے کہ وہ انسانی فکر کے علاوہ پانی، ہوا

اور روشنی کی بھی مالک ہیں چنانچہ اسی بنا پر دشمن نے یہ کہتے ہوئے گھاٹ پر قبضہ کرنا چاہا:

ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں اودھر ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضے پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم نعرہ کیا اسد نے "کہ تم سے ہٹیں گے ہم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
پھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

لیکن بڑا بھائی جس وقت یہ سمجھاتا ہے کہ:

ہر چند اس میں کوئی تمہارا نہیں قصور ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دور جانے دو، جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا
بس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا

بھائی بھائی کو محبت و شفقت کی ایسی بھاری زنجیریں پہنا دیتا ہے جسے کاٹنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ میر انیس اس پہلو کو دیکھ رہے ہیں:

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم		بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم		چپ ہو گئے، قریب جب آئے شہہ امم

گردن جھکا دی، تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

چھوٹے بھائی کی محبت کڑی آزمائش سے دوچار ہے۔ جوان بھتیجا مرنے جائے اور چچا دیکھتا رہے۔ بھائی بیٹے کی لاش کیوں کر اٹھا سکے گا۔ اس لئے بڑے بھائی سے اذن جنگ کے خواہاں ہیں۔ میر انیس کا معجز نما قلم اس جذبے میں کس طرح نئے رنگ بھر رہا ہے:

بس گر پڑا یہ کہہ کے قدم پر وہ باوفا		جھک کر کہا حسین نے بھائی یہ کیا یہ کیا
قاسم کا ذکر کرتے تھے ہمشکل مصطفیٰ		باتیں تو ان سے تھیں تمہیں کیوں غیض آ گیا

ہم تم تو ساتھ گلشن ہستی سے جائیں گے
اچھا، ہماری لاش کو اکبر اٹھائیں گے

اٹھیئے قدم سے آپ کی الفت کے میں نثار		غصے میں بھول جاتے ہو بھیا ہمارا پیار
آنکھیں قدم پہ مل کے یہ بولا وہ نامدار		بے اذن جنگ سر نہ اٹھائے گا خاکسار

ایسا نہ خجل ہوں رسالت مآب سے
پہلے مروں گا، اکبر عالی جناب سے

شبہ نے کہا کہ سر تو قدم سے اٹھایئے   لیجیئے رضائے حرب نہ آنسو بہایئے
فرقت میں ہم جیئں کہ مریں خیر جایئے   اپنی سکینہ جان سے جاکر مل آیئے

زوجہ کو پیٹتے ہوئے سر دیکھ لیجیئے
بچوں کو اور ایک نظر دیکھ لیجیئے

میر انیس کے انسان کے سینے میں کنبے کی محبت گلاب کی خوشبو بن کر پیوست تھی۔ سب کے ہاتھوں کی گرمی ور عنائی نے خیال و عمل میں چراغ جلا دیئے تھے۔ سب ہاتھ ساتھ تھے تو منزل تک پہنچنا آسان تھا۔ لیکن جب سب چراغ بجھ گئے تو فکر کا سوچنے سے انکار کر دینا فطری بات تھی۔ قدم کا تھم جانا۔ فطری عمل تھا۔ درد پھیل گیا۔ سیاہی کی آہنی میت کو دفناتے ہوئے جوان بیٹے اور بھائی یاد آگئے بس اتنا ہی کہا۔۔۔۔۔

ناگاہ سوئے لاش پسر جا پڑی نظر   چلائے دل کو تھام کے' سلطان بحر و بر
اکبر اٹھو کہ گرتا ہے گھوڑے سے اب پدر   سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر

بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نماز عصر پڑھو ساتھ باپ کے

عباس نامدار ترائی سے اٹھ کے آؤ   پھنکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
چھڑکو مری ذرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ   جاتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ

ہم سب کے کام آئے ہیں پیٹے ہیں روئے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں

لیکن یہ سب کچھ ایک لمحے کے لئے تھا۔ دوسرا لمحہ عالمگیر انسانی محبت کے سمندر پر محیط ہو گیا۔ ہر رنگ جلد بدن' ہر رنگ سوز گلو' اور ہر رنگ لخت جگر سے جڑ گیا۔ درد شجر کی طرح پھیل گیا۔ ناتر رشیدہ آرزوں' نادمیدہ حسرتوں' جھلے ہوئے ہونٹ' گرسنہ نگاہوں نے دل کے رخسار پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان جذبات کو پڑھا' جو ابھی سینے سے باہر نہیں آئے تھے' ان ہچکیوں کی صدا سنی جو ابھی سینے میں بند تھیں۔ ان کلیوں کی تہوں میں لہو بہتا دیکھا جو ابھی کھلی نہیں تھیں "خاک کہن سے گوہر جاں" نکالنے۔ آنسوؤں کے دائرے میں موتیوں کی دکان سجانے کی آرزو مستحکم ہو گی۔ "لمحہ" آگ و خون سے گزر کر پگھلا نہیں۔ فولاد' سونا اور کندن بن گیا۔ جس نے انسانی عدالت میں کھڑے ہو کر سنگین تاریکی کو دفنانے اور انسانی زندگی کے افق پر آفتاب تازہ طلوع کرنے کا عہد کر لیا۔ میر انیس کے انسان کی یہ چوتھی سطح تھی۔ جو انسانی درد کے آفتاب میں ڈھل گیا تھا۔ نظریہ حیات کو تکمیل تک پہنچانے کی للک اور لگن نے اسے اس مقام پر کھڑا کر دیا۔ میر انیس نے اس پہلو کی یوں عکاسی کی :

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں تشریف جانماز پہ لائے شہہ زماں

سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں صوت حسن سے اکبر مہ رو نے دی اذاں

ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی

گویا صدا رسول کی کانوں میں آگئی

صف میں ہوا جو نعرہ قد قامت الصلوٰۃ — قائم ہوئی نماز' اٹھے شاہ کائنات

وہ نور کی صفیں' وہ مصلی ملک صفات — قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رد نجات

جلوہ تھا تابہ عرش معلیٰ حسینؑ کا

مصحف کی لوح تھی کہ مصلیٰ حسینؑ کا

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز — بسم اللہ آگے جیسے ہو' یوں تھے شہ حجاز

سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہ سرفراز — کرتی تھی خود نماز بھی انکی ادا پہ ناز

صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی

سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلہ انام — آئے مصافحے کو جوانان تشنہ کام

چومے کسی نے دست شہنشاہ خاص و عام — آنکھیں ملیں کسی نے قدم پر بہ احترام

کیا دل تھے' کیا سپاہ رشید و سعید تھی

باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

جنگ جہل و تاریکی' نفرت اور زرگری کا مقدر ہے۔ جو اپنے معاشی تضادات کے بھنور سے نکلنے کے لئے انسانوں پر مسلط کرتا ہے۔ اور انہیں دھان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر بنگ کا ایندھن بناتا ہے۔ ہوس اقتدار کو تقویت بخشتا ہے۔

امن زمین کی آسودہ تمنا' بچے کا کھلونا' بہن کا غرور' ماں کا سنہرا آنگن ہے۔ زندگی و ارتقاء کی قوت جنگ میں پہل نہیں کرتی۔ لیکن اگر جہل

شعلوں کو بھڑکا دے تو وہ اسے ٹھنڈا کرنا بھی جانتی ہے۔۔۔۔ کیونکہ وہ زندگی کے اس فلسفے سے آگاہ ہوتا ہے کہ امن جنگ سے زیادہ طاقتور اور زندگی موت سے زیادہ توانا ہوتی ہے۔ انسان ایٹم بم سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ میر انیس کا انسان اپنی پختگی نظر اور شعلگی عمل کی روشنی میں "من انداز قدرت رامی شناسم" کی منزل پر تھا۔۔۔۔ اس کے ذہن کی ایک لازوال مسکراہٹ دشمن کے حرب وضرب کے سامنے فتح و ظفر کا اعلان تھا:

بیٹھے تھے جانماز پہ شاہ فلک سریر ناگہ قریب آکے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکر شریر عباس اٹھے تول کے شمشیر بے نظیر
پروانہ تھے سراج امامت کے نور پر
روکی سپر حضور کرامت ظہور پر

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرور زماں باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکر گراں
تم جا کے کہہ دو خیمے میں یہ اے پدر کی جاں بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردن اصغر ہدف نہ ہو

اٹھے یہ شور سن کے امام فلک وقار ڈیوڑی تک آئے ڈھالوں کو روکے رفیق و یار
فرمایا مڑ کے "چلتے ہیں اب بہر کارزار کمریں کسو جہاد پہ' منگواؤ رہوار
"امت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو"

جہل افروز و ذکاوت بیزار معاشرے میں جہاں مکر عقیدے کا لبادہ

اوڑھ کر تاریخ کو ہولناک انجام سے دوچار کر دیتا ہے۔ وہاں ہوش و خرد اور زندگی دامن کی قوتوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اسباب و علل کا تجزیہ انہیں یہ بتاتا ہے کہ قوت و طاقت کا مقابلہ اسلحے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار ادراک و آگہی پر ہوتا ہے اور جو شخص جتنا ہی باخبر ہوتا ہے اتنا ہی وہ انسانی عدالت میں زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ میر انیس نے اپنے انسان کے اس فلسفیانہ پہلو کو یوں اجاگر کیا :

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور　　نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
ان سے منظور نہ تھی جنگ، پر اب ہوں مجبور　　خیر لڑلو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لئے لشکر ناری آئے
کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں　　زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
مجھ کو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں　　تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ، صبر اسے کہتے ہیں

امن سے محبت کرنے والوں کا منشور بس اتنا ہی ہوتا ہے :

ہم دولت دنیا کبھی گھر میں نہیں رکھتے　　توقیر زر و مال نظر میں نہیں رکھتے
رکھتے ہیں قدم خیر میں شر میں نہیں رکھتے　　کچھ اور بجز تیغ کمر میں نہیں رکھتے
نذر رہ معبود تن و سر ہے ہمارا
زیور ہے یہی اور یہی زر ہے ہمارا

باطل حق کی زد پر آکر تلملا اٹھتا ہے۔ اندھیرا روشنی کی تاب نہیں لا سکتا۔ تیروں نے امن کی طرف رخ کیا ہے۔ میر انیس کے انسان نے اتمام حجت کے لئے میدان کا رخ کیا ہے۔ اس مقام پر میر صاحب اپنے ممدوح کے ذہن کی ہر کروٹ کا مطالعہ یوں کرتے ہیں :

مہمیز کر کے اسپ کو آگے بڑھے امام
اعدا سے اس طرح بہ فصاحت کیے کلام
اے سر کشان کوفہ و روم و عراق و شام
کرتا ہوں تم پہ آخری حجت کو میں تمام
کوئی بھی کاٹتا ہے گلا بے گناہ کا
میں کون ہوں جناب رسالت مآب کا

جہل نے اصرار کیا یہ کہتے ہوئے :

مانیں گے فاطمہ کو نہ شیر الٰہ کو
کاٹیں گے بوسہ گاہ رسالت پناہ کو
پہلے تو مسکرائے یہ سن کر امام دیں
اعدا پہ کی نظر صفت شیر خشم گیں
ساتوں فلک لرز گئے الٹی جو آستیں
دیکھا جو سوئے چرخ تو ہلنے لگی زمیں
چمکی جو ذوالفقار نکل کر غلاف سے
پریاں بچا کے جا اڑیں کوہ قاف سے
کعبہ ادھر تھا جلوہ نما اور ادھر کنشت

دوزخ کی آگ اُدھر تھی اِدھر گلشن بہشت

کھیتی اِدھر کرم کی اُدھر تھی ستم کی کشت

یاں کار نیک ہوتے تھے' واں فصل ہائے زشت

شیطاں تھا اس طرف تو ادھر کردگار تھا

میدان میں مقابلہ نور و نار تھا

میر انیس نے دیکھا کہ ان کا انسان رزاق تہذیب ہے۔ جس نے زندگی کی اس بنیادی قدر کو کہ بیدار نظر انسانوں کی قوت احساس کو زرو جواہر دے کے سلب کرنا۔ اور ان کی جرات اظہار کو چھین لیا۔ انسانی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اس کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور بتایا کہ فکر و نظر پر پابندی ایک سلسلہ فکر اور سلسلہ ایجادات پر پابندی ہے۔ جو کسی بھی طرح قابل قبول نہیں۔ اس تہذیبی قدر کو لہو دے کر آتشیں رخسار بنانا انسانی فریضہ ہے۔

میر انیس کے قلم نے ادب کو اس پہلو سے بھی روشناس کرایا کہ ان کے اس انسان نے فکری و عملی طور پر یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ طاقت کے خوف سے فرد کے شعوری فیصلوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ ریاست جبر پر مبنی ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن کسی حکومت کا یہ اصرار کہ اس کے غلط اقدامات کو باشعور انسان صحیح ہونے کا سرٹیفکیٹ دیدے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے یہ وہ نازک مرحلہ ہے جو آزاد اور بااصول

انسانوں کو تاریخ کے نازک ترین موڑ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ میر انیس نے جذبے کے خلوص اور فکر کی بالیدگی کی روشنی میں اردو ادب کو اس فکر سے بہ حسن و خوبی روشناس کرایا کہ تاریخ کے نازک مرحلے پر ان کے انسان نے سفید و سیاہ دھاگوں کو اس طرح لگایا کہ کوئی دھاگا کہیں خلط ملط نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اپنے انسان کے ذریعے ادب کے دامن میں یہ موتی بھی پروئے کہ کسی بھی حکومت کی یہ کوشش کہ وہ اپنی ناقص فکر طاقت کے ذریعے منوالے۔ ذی شعور انسانوں کے لئے قابل قبول نہیں۔

میر انیس نے اس پہلو کا بھی مطالعہ کیا اور ادب کو اس پہلو سے روشناس کرایا کہ حق کی حمایت کے معنی ظلم کی ان قوتوں سے انتقام لینے کے بھی ہیں جو اپنے مفادات کے تحفظ اور اقتدار کو بچانے کی خاطر شکستہ کمر انسانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ عورتوں کو پابہ زنجیر اور حق کو دار پر لٹکا دیتے ہیں۔

میر انیس نے ادب کے افق کو مختلف پہلوؤں سے روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے انسان کے حوالے سے اس پہلو کی بھی نشاندہی کی اور ادب میں اسے روشناس بھی کرایا کہ حق کی راہ میں شہادت ہر عہد کے لئے پیغام مسلسل ہے۔ شہادت گواہ بھی ہوتی ہے اور حاضر بھی۔ وہ ہر قرن و ہر عہد کے معرکہ حق و باطل میں زندہ رہتی ہے۔ حج کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے

انہوں نے یہ بھی دکھایا کہ ان کے انسان نے حج کو ادھورا اس لئے چھوڑ دیا تاکہ ہر دور کے حاجیوں کو یہ بتا دیا جائے کہ ظالم کے خلاف جہاد افضل ترین جہاد ہے۔۔۔۔۔ اگر مقصد سامنے نہ ہو تو خانہ کعبہ کا طواف اور بت خانے کا طواف برابر ہے۔ میر انیس نے اس کی بھی تشریح کی۔ کہ اگر کوئی شخص معرکہ حق وباطل میں خاموش اور کنارہ کش ہے تو خواہ وہ نماز پڑھے یا شراب پیئے دونوں برابر ہیں۔ تاریخ کے معرکے میں "حاضر رہنا" جہاد کا اصل مطلب ہے اور "غیر حاضر" ہونا یہ ہے کہ مظلوم کو ہری گھاس چرنے والوں کے رحم وکرم پر تنہا چھوڑ دیا جائے۔ محراب و منبر میں پناہ ڈھونڈی جائے۔ طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی ظلمتوں سے سازباز کی جائے۔ میر انیس نے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

میر انیس نے یہ بھی بتایا کہ ان کا انسان کہہ رہا تھا کہ دیکھو میرا خون ایک قطرے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس قطرے نے طے کر لیا ہے کہ وہ ابد تک دنیا کو 'حق' اور 'ناحق' کا راستہ دکھاتا رہے گا۔

اقبال

Sajida
99

اقبالؒ

اقبالؒ انسان کی زندگی کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے؟ اس کی نظر میں کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ اندھیرے کے دامن میں وہ روشنی کی جوت کیسے جگا سکتا ہے؟ سیم و زر کے تلے مرجھائی ہوئی کلیوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کو وہ کس طرح آزادی کی نوید سحر دیتا ہے؟ اسباب و علل کے رشتے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

کسی بھی انسان کے مزاج کو بنانے اور اس کی تعمیر و تشکیل میں خاندان اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کیونکہ خاندان کا اپنا ایک مخصوص تصور حیات، عقائد، طبقاتی روابط، پابندیاں اور آزادیاں، اقدار کو جانچنے کی کسوٹی، اور رخ حیات کی اپنی ایک جہت ہوتی ہے۔

اقبالؒ کے انسان نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ مذہبی تھا۔ جہاں ہر آن تکبیر کی صدائیں بلند تھیں۔ والد چونکہ صوفی منش تھے اس لئے ان کے حوالے سے مولانا رومؒ سے بھی گہری عقیدت تھی۔ جس کا شعلہ اقبالؒ کے وجود میں کبھی سرد نہیں ہوا۔

کہنے کو تو گھر میں زندگی کی تمام نعمتیں موجود تھیں۔ دل بہلانے

کے سامان میسر تھے۔ لیکن دل کی ویرانی اس انسان کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ تنہائی کے آسیب نے دل و دماغ کو جکڑ دیا تھا۔ پریشانی، اضطراب، مسلسل جستجو، آرزو اور تحیر کا جذبہ اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ہر آن بدلتی ہوئی کائنات کا راز معلوم کرنے پر اکساتا۔

اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور میری زندگانی بے گداز آرزو

مطمئن ہے تو، پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

یہی جستجوئے مسلسل اسے فطرت سے ہم کنار کرتی تاکہ کائنات کے رازہائے سربستہ معلوم ہو سکیں۔

تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے دراں رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں لے کر غم کو سو جا

ہر یکے مانند ما بیچارہ ایست در خفائے نیلگوں آوارہ ایست
این جہاں صید است و صیادیم ما یا اسیر رفتہ از یا دیم ما

زار نالیدم صدائے برنخواست
ہم نفس فرزند آدم را کجاست

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابے ہمیشہ در طلب رستی چہ مشکلے دارد؟
ہزار لولوے لالاست در گریبانت درون سینہ چومن گوہر دلے داری؟

تپید و از لب ساحل رمید و ہیچ نگفت

شدم بحضرت یزداں گذشتم از مہ و مہر کہ در جہان تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی زدل و مشت خاک من ہمہ دل چمن خوش است ولے در خور توایم نیست

تبسمے بہ لب اور سیدہ ہیچ نگفت

اقبالؒ کا یہ انسان اپنے اردگرد سانسوں کے چلتے پھرتے جنازے دیکھتا ہے جن میں گرمی، حرارت اور رعنائی نہیں ہے۔ تلاش اور جستجو کا جذبہ نہیں ہے۔ ان حالات سے وہ غیر مطمئن ہے۔ اس کی تنہائی اور بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ فطرت کا حسن بھی اسے تشنہ لبی بخشتا ہے۔

یہ کیفیت ہے مری جان ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی

اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

لیکن اقبالؒ کا یہ انسان جس وقت ''بسیار سفر باید'' کی منزل سے گزرتا ہے یورپ کا سفر کرتا ہے۔ تو تنہائی و تحیر و غم کا محور بدل جاتا ہے۔ تلاش و جستجو اور غم و درد کے رشتے دور تک پھیل جاتے ہیں۔ اپنی تنہائی و اپنا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ فرنگیوں کی خونچکاں داستانوں کی تہوں سے معاشی تاراجی کا طوفان اٹھتا نظر آتا ہے۔ وطنیت' اور نسل پرستی کے سرکش ناقے محکوم و مظلوم قوموں کو روندتے نظر آتے ہیں۔ ''جمہوری نظام کی نیلم پری'' کے پردے سے لہو میں ڈوبا ہوا انسان ابھرتا نظر آتا ہے۔ محکوم انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی پستی' ناداری' انتشاری کیفیت اقبالؒ کے انسان کو یوں تڑپا دیتی ہے۔

رو لے اب جی کھول کر اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے

کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

فرنگیوں کی چیرہ دستیوں نے اقبالؒ کے انسان کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیا جس کے شعلے اس کے قلم سے یوں ٹپک پڑے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے　　قیامت ہے کہ انسان نوع انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　　یہ ضاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو

ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

یاد ایامے کہ بودم در خمستان حرم فرنگ　　جام او روشن تر از آئینہ اسکندر است

جلوہ اوبے کلیم و شعلہ او بے خلیل　　عقل ناپردا متاع عشق راغارت گر است

رہزنی را کہ بنا کرد جہاں بانی گفت

ستم خواجگی او کمر بندہ شکست

بے حجابانہ ببانگ دف و نے می رقصد

جامے از خون عزیزان تنگ مایہ بدست

سیاست حاضرہ پر یوں نگاہ ڈالتا ہے:

می کند بند غلاماں سخت تر
حریت می خواند اورا بے بصر
گرمی ہنگامہ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید
سلطنت را جمع اقوام گفت
کار خود را پختہ کرد و خام گفت
الحذر از گرمی گفتار او
الحذر از حرف پہلو دار او

اقبالؒ کا انسان قومی وبین الاقوامی سطح پر بے آسرا و بے سہارا انسان کو خونی جبڑوں سے چھڑانے کے لئے بغاوت وانقلاب کی تاریخ و مرتب کر رہا تھا۔ وہ پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ آنکھوں کی راہ سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اور محکوموں کے لئے آزادی و مسرت کے راگ اس طرح الاپ رہا تھا۔

من درایں خاک کہن گوہر جاں می بینم — چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ راکہ بہ آغوش زمیں ہست ہنوز — شاخ در شاخ برو مندو جواں می بینم

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہر نغمہ زلرزیدن تارے بیند

آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک　　　بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائیگی

اقبالؒ کا انسان آزادی و مسرت کا راگ الاپتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ ذرہ ذرہ آفتاب میں ڈھل جائے۔ ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن ہو جائے۔ وجود خاکی میں اپنی بلندی کا یقین پیدا ہو جائے۔ کیونکہ یقین ہی وہ قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے جو انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنا تعارف خدا سے کراتے ہوئے نہیں جھجکتا۔

توشب آفریدی چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبالؒ کا انسان قوت ہی نہیں شعور کا بھی سر چشمہ ہے۔ انہوں نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب "The Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.ii," میں اس امر کی جانب اس طرح اشارہ کیا ہے۔

"His career, no doubt, has a begenning but he is destined, perhaps to become a

permanent element in the constitution of

being."

یعنی خدا نے انسان کے اندر بقائے دوام حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھ دی ہے۔ بلند ہمت انسان ہمیشہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا امتحان لیتا ہے۔ علم و فکر، شعوری عمل اور آزادی کو بروئے کار لاکر وہ زمین پر خدا کا نائب بن سکتا ہے۔ کیونکہ امانت الٰہی اسے ہی سونپی گئی ہے۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

اقبالؒ کے انسان کے فلسفہ حیات کی اساس حرکت پر ہے۔ جمود سے اسے نفرت ہے۔ "حلقہ یاراں میں وہ ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں وہ فولاد" ہے۔ اس کی فکر کی اساس آزادی فکر و نظر پر ہے۔ جہاں کسی دوسرے فرد کو اختیار نہیں کہ وہ گرم سلاخوں کے شامیانے اس پر تان سکے۔ اس لئے کہ انسان ذہن کائنات کی لو، فکر کی جگمگاہٹ اور کردار کی پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ غلامی میں اس کی زندگی "جوئے کم آب" اور آزادی

میں ''بحرِ بیکراں'' بن جاتی ہے۔ اس لئے آزادی کی تلاش اقبالؔ کے انسان کی سب سے مقدس آرزو ہے۔ ''مذہب فروشوں کے بندھے ٹکے عقیدوں سے آزادی، قوم پرستی کے کھوکھلے نظریوں اور تنگ نظر ذہنیت کے نعروں اور فتوؤں سے آزادی، زرگری اور جنگ زدہ رویوں سے آزادی .... آزادی اس لئے تاکہ زندگی امن و مسرت کے راگ الاپے .... ذہن بیداری اور نشاط سے ہم آہنگ ہو ..... ساری پگ ڈنڈیاں انسانی آزادی کی شاہراہ سے جڑ جائیں۔

اقبالؔ کے انسان کو حقائق کا ادراک ہے۔ حقیقت ریل کی پٹڑی کی طرح اس کے یہاں ایک مقام پر جمی نہیں ہے بلکہ الفاظ و آواز، زمان و مکاں کے ساتھ خود حرکت میں ہے۔ اشیاء و افعال کی حرکت جس میں انسانی ہستی کا دل دھڑکتا ہے ..... اسے ''خانقاہ'' کے فرار سے نفرت ہے۔

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کا
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

زندگی اس کے نزدیک خود مقصد نہیں ہے بلکہ اعلیٰ مقصد و مسلک حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر زندگی ہی کو مقصد سمجھ لیا جائے تو مسرت اندوزی اور لذت کوشی کا وہ فلسفہ وجود میں آتا ہے جسے یونان نے جنم دیا تھا۔ اور جسے عام طور پر نشاط پرستی یعنی Hedonism سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن

اقبالؒ کا انسان اس مسرت کا جویا ہے جو مادی بھی ہو اور روحانی بھی۔ ایسی مسرت جو سچی محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جو یقین دلاتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور بڑے بڑے غموں میں شریک ہے۔ یہ بات زندہ رہنے کا جذبہ و حوصلہ عطا کرتا ہے۔

اقبالؒ کا انسان سمجھتا ہے کہ وہ اس دنیا کی تعمیر حقیقی معنی میں اس لئے نہیں کر سکا کیونکہ اس نے "خودی" کو کھو دیا ہے۔ خودی زندگی کی اصل حقیقت ہے جس سے زندگی میں حسن و رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ نہیں تو انسان مٹی کا ڈھیر ہے۔۔۔۔ خودی کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو تین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ (اول) اطاعت۔ (دوم) ضبط نفس۔ (سوئم) نیابت الٰہی۔

اطاعت کے ذریعے انسان وحدت انسانی کے عقیدے سے جا ملتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس طرح کائنات، تخلیق اور زندگی کو سمجھنے میں "اکتارہ" کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس دروازے سے وہ دوبارہ عمل کے میدان میں اترتا ہے۔ سالہا سال کی افسردہ تقسیم در تقسیم کرتی ہوئی کڑیوں کو وہ کاٹ دیتا ہے۔

زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے۔ ہر لمحہ بدلتی ہوئی کائنات اور اس کی اصل حقیقت سے ہم آہنگی کے لئے بے قراری کا اظہار کرتا ہے۔

دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے۔ اس کے لئے عرفان ذات ہو' مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ اور باطنی کرب سے انسان گزرتا ہے۔ تاکہ حرص و ہوس' خوف ولالچ' ڈھیری کا لپکا' تعجیل کی پھسلن' جھوٹے نگینوں پر ملمع کاری کرنے کی آرزو، مصلحت کوشی و مصلحت بینی کے جذبات پر قابو پایا جاسکے۔

ان دو مرحلوں یعنی اطاعت اور ضبط نفس سے گزرنے کے بعد اقبالؒ کا انسان تیسرے مرحلے یعنی نیابت الٰہی کی منزل پر قدم رکھتا ہے۔ اطاعت' اصل روح اسلام سے آشنا کرتی ہے۔ جو عقیدہ توحید' رسالت اور قرآن پر ایمان رکھنے پر مشتمل ہے۔ اقبالؒ کا انسان توحید کے عقیدے سے وحدت انسانی کے عقیدے تک پہنچتا ہے۔ ایک خدا پر ایمان جیسا کہ کہا گیا چھوٹے خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے سے بچاتا ہے۔ ضبط نفس کا احتساب اگر جاری نہ رہے تو خودی کا متلاشی خطرناک سمت اختیار کر سکتا ہے۔ جیسے ابلیس جو اطاعت میں پختہ تھا۔ لیکن ضبط نفس کی منزل میں ٹھوکر کھا گیا۔ چونکہ پیغمبروں نے تینوں مراحل طے کئے اس لئے وہ زمین پر نائب الٰہی قرار پائے۔ اور ''مرد کامل'' بن کر انسانوں کے لئے مجسم عید بن گئے۔

اس مقام پر میر انیس اور اقبالؒ میں سب سے زیادہ گہری ذہنی ہم

آہنگی ہے۔ دونوں کا نقطہ نظر ایک ہے۔ 1931ء میں اقبالؒ نے سر ڈینی سن راس سے گفتگو کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے: ''اسلام کا انتہائے مقصود عظمت انسان ہے۔۔۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ نوع انسانی ایک گھرانہ اور ایک خاندان بن جائے۔ اسلام نے اس مقصد کے لئے ایک اسکیم پیش کی۔ یعنی دنیائے اسلام رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات کو بالکل فنا کردے۔۔۔''

(گفتار اقبالؒ، صفحہ ۲۳۵)

انیس کی طرح جس وقت اقبالؒ نے ملت اسلامیہ اور عظمت انسان کو ٹکڑوں میں بٹتے دیکھا تو ان کے شعور پر بھی چوٹ پڑی۔ میر انیس کی طرح انہوں نے بھی انسان کو بلندی پر لے جانے، اسے ''مرد مومن'' کے رتبے پر فائز کرنے اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیا۔۔۔ اس فکری سفر کا پہلا مرحلہ یہ احساس تھا کہ ملت اسلامیہ انتشار سے دوچار ہے۔ ''تعمیر حرم'' آندھیوں کی زد پر ہے۔۔۔

دوسرا مرحلہ ان اسباب کی تلاش تھی جو اس پراگندگی کا سبب بنے۔ تیسرا مرحلہ ان قوتوں کی شناخت کا تھا جنہوں نے ''پرویزی حیلوں'' سے ''انسان'' اور مسلمان کو فریب دے کر اسے باطل کے راستے پر ڈال دیا ہے۔۔۔ اور چوتھا مرحلہ ان قدروں کی نشاندہی کا تھا جو ملت اسلامیہ کا افتخار اور نشان امتیاز تھیں۔ انہیں کیسے اور کس طرح واپس لایا جاسکتا ہے۔ یہ سوال

میر انیس اور اقبالؒ دونوں کے سامنے تھا۔ میر انیس اور اقبالؒ دونوں کو انسان کی معراج اور قوت کا سر چشمہ ''اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا'' میں ہی نظر آیا۔

فاقوں میں صبر و شکر سے دل ان کے سیر تھے
جاں باز تھے' جری تھے' مجاہد تھے' شیر تھے

''ذی جاہ وذی جلالت وذی فہم وذی شعور''

اقبالؒ کے ''مرد مومن'' کے اوصاف بھی یہی ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ہر دور میں خواہ وہ اردو ہو یا فارسی' دونوں میں مختلف شاعرانہ پیکر اختیار کر کے انہیں اوصاف کی جانب ملت اسلامیہ کی توجہ مبذول کی ہے۔ ''جواب شکوہ'' کے چند اشعار میں ان خیالات کی اسطرح تشریح کی گئی ہے ؎

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک
عدل اس کا تھا قوی' لوث مراعات سے پاک

ہر مسلماں ہر رگ باطل کے لئے نشتر تھا
اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر' اس کو خدا کا ڈر تھا

حیدریؓ فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

اقبالؒ کے فکری نظام میں مکمل انسانی زندگی کا جو نقشہ ابھرتا ہے وہ وہی ہے جو میر انیس کے یہاں زیادہ شفاف نظر آتا ہے۔ انیس کی طرح اقبالؒ کی نظر میں ''مقام شبیری'' ایک حقیقت لبدی ہے اور یہ حقیقت لبدی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان اس ''رمز'' کو پالے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حقیقت لبدی ہے مقام شبیریؓ
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

(بال جبریل)

انیس و اقبالؒ دونوں کے یہاں ''حسینی عشق'' کی داستان مختلف عنوان لئے سامنے آتی ہے۔

میر و غالب و انیس کی طرح اقبالؒ کا ''مرد کامل'' اور آئیڈل رسولؐ اور ان کا گھرانہ ہے۔ جو ان کی نظر میں محدود ہو کر لا محدود اور فانی ہو کر لافانی بن گیا۔ تمام ذی شعور، بیدار مغز اور روشن ذہن انسان اس کے ساتھ بلند ترین معیار حق کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ کروڑوں انسانی مغزوں کا عطر بن کر

جہل و نفرت کے ریگزار میں علم و محبت' آزادی و امن کی معطر وادی بن جاتا ہے
ان ہستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبالؒ کا قلم رقص کرتا نظر آتا ہے۔ اور وہ تمام
انسانوں کے مسائل کا حل اسی "اسلامی نظریہ حیات" میں تلاش کرتے ہیں۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدق سلمانیؓ

کبھی تنہائی کوہ و دامن عشق
کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایہ و محراب و منبر
کبھی مولیٰ علیؓ خیبر شکن عشق

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغ عشق اہل بیتؑ
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظل دامن حیدرؓ مجھے

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے
اک ضرب ید اللہی اک سجدہ شبیری

تنقیدی مطالعہ

فن ریاضت، جذبے کی سچائی، زندگی کے شعور، مزاج کی زباں دانی، اظہار کی صلاحیت، عقیدے کی گرمی، اور دلوں تک رسائی کا مطالبہ کرتا ہے انفرادی تجربات فن کی عظمت کو اس وقت چھو لیتے ہیں جب وہ دوسروں کی شخصی دنیا سے مماثلت پیدا کرتا ہے۔ سماجی حقائق سے نہ صرف رشتہ جوڑتا ہے بلکہ نئے سماجی حقائق کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ یعنی تحریر ترغیب عمل پیدا کرتی ہے۔ شاعری اسی معنی میں کوہکنی ہے کہ وہ پیکر شیریں تراشنے کے لئے جوئے شیر لاتی ہے۔۔۔۔۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

ترسیل والبلاغ کی یہی وہ قوت ہے جو شیکسپیئر، گوئٹے اور حافظ کو ہمارے قریب کرتی ہے۔ فن کی یہی وہ کسوٹی ہے جس پر اردو ادب کے یہ عظیم معمار میرؔ، غالبؔ، میر انیسؔ اور اقبالؒ پورے اترتے ہیں۔

رابرٹ فراسٹ نے فن کی عظمت سے بحث کرتے ہوئے لکھا کہ "بڑا فنکار وہ ہے جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت پیدا کرے۔" ناخدائے سخن میر تقی میر نے اس کا سراغ یوں لگایا۔

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا نشانہ ہو

اور یہ بزرگی ان فنکاروں کا حصہ بنی جنہوں نے یونانی دیوتا کی طرح اپنے سینے کا گھاؤ چھپا کر دوسروں کے زخمی سینوں میں پھول بن کھلایا۔ غالب نے تخلیقی جذبے کے اسی طریق کار کو 'دل کو خون کریں گے' استعارے میں اس طرح پیش کیا ہے:

اے ذوق نوانجی بازم بہ خروش آور
غوغائے شب خونی بربنگر ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرد بارم
دل خوں کن حاصل خوں را در سینہ بجوش آور

غالباً بلسکی نے Pathos کے لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا۔ یعنی جس وقت تک حقیقت کا عکس خون میں تحلیل نہ ہو جائے وہ شعری پیکر اختیار نہیں کرتا۔ صحیح پیکر، صحیح تصویر، صحیح آہنگ اور صحیح فکر ''خون جگر'' ہی سے نمود پاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام انسانی محنت، علم، ادب، شاعری کو منڈی کی اشیاء بنا دیتا ہے۔ اعلیٰ ادبی و تہذیبی تخلیق کا جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ غالب کی شکایت اس لئے تھی:

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آئے

میر ہو یا غالب، انیس ہوں یا اقبالؒ سب کا مقدر اسی وجہ سے بس یہی رہا :

فرہاد و قیس و میر یہ آوارگان عشق
یونہی گئے ہیں سکی رہی من کی من کے بیچ

اور یہ سب اس لئے کہ یہ سب عظمت انسان کے پرستار ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ :

"Human history is waiting for the triumpho of the insulted man"

ادب کے ان عظیم معماروں کے درمیان انسان کی تعظیم قدر مشترک ہے۔ اس لئے ان سب کا قلم انسان ہی کے گرد طواف کرتا ہے۔ دوسری قدر مشترک جو ان معماروں کے درمیان ہے وہ ہے سماجی برابری کے نظام پر ان کا ایمان۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک اس کے احساس میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ خیالی نہیں بلکہ مادی حالات کا نتیجہ ہیں۔ جنگ کے نظریات ہوں یا امن کے۔ ان کا تعلق مادی کشمکش سے ہے۔ یہ تمام ادیب اس بات سے آگاہ ہیں کہ جنگ سرمائے کے نظام کی تقدیر ہے۔ جو وہ اپنے معاشی تضادات سے نکلنے کے لئے انسانوں پر مسلط کرتا ہے تاکہ اسلحے کے بازار کی رونق بڑھے۔ حقوق انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر مظلوم اقوام کو محکوم بنایا جائے۔ ان پر گرم سلاخوں کے شامیانے

تان دیئے جائیں۔ زندگی کو "جوئے کم آب" بنادیا جائے یہ سب اس لئے تا کہ دوسروں کی جڑوں سے پانی کھینچ کر اپنی زندگی کی کھیتی میں تری و شادابی لائی جائے۔اور اقتدار کو دوام حاصل ہو۔

میر غالب انیس واقبالؒ سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ امن کا لفظ مجرد نہیں۔وہ سماجی نظام انصاف سے جڑا ہوا ہے۔وہ زمین کی آسودہ تمنا' اوزاروں کی چوٹ سے نکلا ہوا کندن' کھیتوں کا سونا' بہن کا غرور' بچے کی مسکراہٹ' محبوبہ کا آنچل اور ماں کے آنگن کی چاندنی ہے۔

میر انیس کا انسان حریت و آزادی انسان کا جویا اور امن کا شیدائی ہے۔ وہ امن و محبت کا میدانی درخت ہے جو بہت دیر تک جلتا اور لو دیتا ہے۔۔۔۔جنگ مسلط کرنے والوں کو بس اس کا اتنا ہی جواب ہے۔

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پر غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو
شمع ایمان ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی ایک دم میں الٹ جائے گا

موجودہ عہد عظیم الشان تجربات کا عہد ہے۔ ہر سطح پر information کا

explosion ہو رہا ہے۔ دنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہو رہی ہے۔ تشدد کی سیاست نے افہام و تفہیم اور مذاکرات کی جگہ لے لی ہے۔ ہر مقام پر امن و آشتی کے ذریعے مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔۔۔۔۔ غالب، میر، اقبالؒ اور میر انیس نے محسوس کیا کہ ان کا انسان جدید عہد میں سانس لیتا ہے جب وہ دشمن کو امن کی راہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے پھر وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مسائل کے حل کا انحصار قوت و طاقت پر نہیں بلکہ ادراک و آگہی پر ہوتا ہے۔ فرد جتنا ہی باخبر ہوتا ہے اتنا ہی وہ انسانی تاریخ کی عدالت میں زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

صرف اتنا ہی بلکہ ادب کے ان عظیم معماروں میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ یہ سب سچائی اور سادگی کے جویا ہیں۔ ایسی سادگی و سچائی جو تلاش، جستجو اور قربانی سے حاصل ہوتی ہے اور انسان کو رفعت بخشتی ہے۔

اس طرح میر تقی میرؔ، غالبؔ، انیس اور اقبالؒ کے افکار و خیالات میں گہری ذہنی قربت اور ہم آہنگی ہے لیکن ایک رنگ جو میر انیس کا میرؔ، غالبؔ اور اقبالؒ سے جدا ہے اور جو انتہائی چوکھا، انوکھا، منفرد اور اچھوتا ہے وہ یہ ہے کہ ادب کے ان عظیم معماروں نے میر انیس کے انسان اور اس گھرانے کی چوکھٹ پر سجدے تو بلا شبہ کیئے لیکن کسی نے اس گھرانے کے

افراد کو رشتوں کے روشن اور مقدس دائروں کے حوالے سے اس طرح نہیں پہچانا جیسا کہ انیس نے۔ یہ اعزاز صرف میر انیس کو حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے انسان کو رشتوں کی مقدس بانہوں میں رہتے ہوئے انسانوں کو جینے کا سلیقہ عطا کرتے دیکھا۔

جدید عہد میں کنبے کی محبت کا تصور شکست و ریخت سے دوچار ہے لیکن میر انیس نے اس پہلو کا بھرپور احاطہ کیا اور بتایا کہ ان کا انسان نہ صرف افراد' خاندان اور اعزاء و اقربا سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے بلکہ وہ ہر فرد کے مزاج اور شعور کے مطابق ان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو ایک وحدت میں تبدیل کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔ وحدت میں تبدیل کرنے کے معنی فرد کی اپنی "انا" اور انفرادیت کو ختم کر دینے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر فرد کا اپنا ایک اچھوتا اور منفرد انداز ہوتا ہے۔ لیکن اگر فرد کی "انا" اجتماعی زندگی سے الگ راہ بناتی ہے اور عام مفاد کے تابع نہیں ہے تو وہ اگر معمولی انسان میں بھی پیدا ہو جائے تو وہ معاشرے کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیتی ہے۔

اس کے علاوہ میر انیس نے اپنے انسان کے توانا ذہن کے دہکتے ہوئے گلزار میں اتر کر پہلی مرتبہ اس پہلو کا بھی مطالعہ کیا کہ ان کا انسان افراد خاندان کی بے مقصد و بے جہت زندگی گزارنے کے حق میں نہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کی حیثیت بہتے ہوئے پانی کی مانند ہو جاتی ہے جس کی اپنی کوئی

سمت متعین نہیں۔ افراد خاندان کی صلاحیتوں کو ڈیم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے گھر کا سرپرست اپنی ذات میں اعلیٰ صفات، جیسے حق گوئی، راست گوئی، شجاعت، بہادری، تزکیہ نفس، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کرے۔ پھر ان صفات کو ایک اعلیٰ مقصد اور مسلک کے تابع کر دے۔ اس کے بعد جہل اور تیرگی کی آہنی میت کو دفنانے کے لئے اپنے جسم و جاں کے شعلوں کو یوں علم بنا دے کہ ظلم کی فصیلیں ڈھے جائیں ''انکار'' جوش غضب کے انگاروں کو ٹھنڈا کر دے۔ اور سحر کا روشن افق سامنے آجائے۔

میر انیس نے اپنے انسان کے ذہن کے اسرار و رموز تک پہنچتے ہوئے یہ نکتہ بھی دریافت کیا کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب فرد شعوری طور پر معاشرے کی رفتار ارتقاء اور فلسفہ تغیر سے آشنا ہو۔ کیونکہ تیرگی کی قوتیں مٹی کو پانی میں ڈال کر اس قدر گدلا کر دیتی ہیں کہ تہہ تک نظر پہنچنے نہیں پاتی۔ بقول حجاب احسانی ؎

تا ہو نہ دروغ و حق کی تمیز
گدلا دیا اس نے سارا پانی

میر انیس کے انسان نے نظر کو اس طرح صیقل کرنے کا درس عطا کیا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

مایہ ناز شاعر فیض احمد فیض کا مشہور مصرعہ ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ "یعنی محبت انقلاب کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ محبت کے شعلوں پر انقلاب کے بعد ہی شبنم کا چھڑکاؤ ممکن ہے لیکن منفرد اور اچھوتے شاعر مجروم سلطانپوری نے اس کشمکش کو یوں حل کر دیا ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ظاہر ہے میر انیس کے پیش نظر یہ پہلو تو اس وقت نہیں تھے لیکن ان کے ذہن کی اونچی لو نے اپنے انسان کے اس رمز کو پالیا کہ وہ محبت اور مقصد کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ مکمل انسان ہے اس کے نزدیک کنبے کی محبت بنیاد ہے جس پر عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اعزاء و اقربا بازو ہیں جس سے انسان پرواز کرتا ہے۔ بیوی و محبوبہ لیلیٰ ہیں جو روح میں گلشن کھلاتی ہیں۔ جناب شیریں سے متعلق مرثیہ اس کا گواہ ہے۔ میر انیس نے محسوس کیا اور اپنے اشعار میں اس کی تشریح بھی کہ ان کے انسان کے یہاں محبت اور انقلاب یوں جڑے ہوئے ہیں جیسے سورج اپنی کرن سے' دریا اپنی موج سے اور عاشق اپنے معشوق سے۔

عام طور پر خاندانوں میں خورد و بزرگ حضرات اپنی اپنی ٹولیاں الگ بنا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کی سوچ' طرز فکر اور طریق زندگی مختلف ہوتا

ہے۔اس طریق فکر کو جدید عہد میں "generation gap" کا نام دیا جاتا

ہے لیکن میر انیس کی فکر کی پرواز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انسان کے

اس پہلو کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اسے ادب کے حوالے کر دیا۔

کہ ان کا انسان نہ صرف خورد و بزرگ کی حدوں کو توڑ دیتا ہے بلکہ اسے ذہنی

افلاس سے تعبیر کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر خورد و بزرگ میں ذہنی رفاقت'

ذہنی ہم آہنگی اور ذہنی لگاوٹ ہے جو مقصد و مسلک کے مشترک ہونے کے

نتیجے میں پیدا ہوتی ہے تو دوری قربت میں بدل جاتی ہے۔ پھر خاندان کے

افراد کے ارادے کا صداقت' جذبے کا خلوص' مقصد کی بلندی' فکر کی شعلگی

اور کردار کی پاکیزگی' کروڑوں انسانی معجزوں کا عطر بن کر تاریخ پر چھا جاتی

ہے۔

میر انیس نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ یہ پہلو بھی ادب کے

حوالے کیا کہ ان کے انسان نے ذاتی غم کو کائنات کے غم میں کیسے اور کس

طرح ڈھال دیا۔ ساتھ ہی اس پہلو کی بھی نشاندہی کی کہ انسانیت متحد ہو کر

ہی انسان کو نئی بلندیوں سے آشنا کر سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے

تانے بانے پر یہ رنگ بھی لگایا کہ نفرت کا جذبہ صرف وہاں ملتا ہے جہاں

ثقافت اپنی پست سطح پر ہوتی ہے۔ اس کی سطح انسان کو انسان نہیں بلکہ

درجات کے حساب سے گنتی ہے۔ میر انیس نے اپنے انسان کے حوالے سے

اس پہلو پر بھی نظر ڈالی کہ زندگی اندھی قوت نہیں بلکہ اس کے لئے زندگی کا علم بھی ضروری ہے۔ اس کا علم ہی یہ بتاتا ہے کہ زندگی تاریکی سے روشنی میں کیسے آتی ہے وہ اپنی ذات کو جبلت پر دہرانے کے بجائے انسان کیسے بنتی ہے۔ اور کسی آئیڈیل کے سہارے آنسوؤں کے دائرے میں موتیوں کی دکان کیسے سجاتی ہے۔ ان ہچکیوں کی صدا کو کیسے سنتی ہے جو ابھی سینے سے باہر نہیں آتی ہیں یہ ان جذبات کو کیسے گنتی ہے جنہیں ابھی مضراب نے نہیں چھیڑا ہے۔ ان پھولوں کی خوشبو کو کیسے پالیتی ہے جو ابھی شاخ پر کھلے نہیں ہیں۔ اور ان گلیوں کی دھجیوں کو کیسے علم بنالیتی ہیں جو ابھی بکھری پڑی ہیں۔ یہ زندگی کا شعور ہی بتاتا ہے کہ زمین پر تاریکی نے جو ڈیرا ڈالا ہے اسے کیسے کاٹا جائے اور اس نظام سے کیسے انتقام لیا جائے جو جوانوں کی لاشیں گراتا ہے۔ بچوں کو تیر کا نشانہ بناتا ہے۔ عورتوں کو قیدی بنا کر دربدر پھراتا ہے۔ زمین کو گرسنہ نگاہوں اور جھلسے ہوئے پتے بدن کا صحرا بنادیتا ہے۔ یہ زندگی کا عرفان ہی ہے جو اس پہلو کی نشاندہی کرتا ہے کہ سیلاب کس طرح قصر فرعون کو بہا لے جاتا ہے۔ ظلم کی چلچلاتی دھوپ کو چاندنی میں بدل دیتا ہے۔ اپنی ناتواں کلائی سے توانائی کی کلائی کو مروڑ دیتا ہے اور خسروی کی پیشانی کو ہمیشہ کے لئے عرق ریز کردیتا ہے جیسا کہ ابتدا میں کہا جاچکا ہے میر انیس کا انسان اور اس کا گھرانہ ہر ذی شعور، بیدار مغز اور روشن ذہن انسان کا آئیڈل ہے۔ میر،

غالب، اقبالؒ، سب جہل کی سنگین تاریکی کو کاٹنے اور اس کی آہنی میت کو دفنانے کے لئے اسی گھرانے کو دست گیری کے لئے پکارتے ہیں۔

انیس و اقبال دونوں نے شبیرؑ کے سرمایہ ہی کو مسلمانوں کی میراث اور اس کا حسین ترین اثاثہ گردانا۔ اور ہر نہج اور ہر انداز سے اسے مسلمانوں تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تاکہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ اور کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل کرلیں۔ ان کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان ''دامن شبیر'' کو مضبوطی سے تھام لیں۔ بعض مقامات پر تو اقبال میر انیس سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

آں کہ بخشد بے یقیناں را یقیں آنکہ لرزد از سجود او زمیں

آن کہ زیر تیغ گوید لا اللہ آنکہ از خونش بروید لا الہ

رشتہ آئین حق زنجیر پاست

پاس فرمان جناب مصطفیٰ است

ورنہ گرد تر بتش گردید مے

سجدہا بر خاک او پاشید مے

یہی وہ گھرانہ اور اس کا 'انسان' ہے جسے میر انیس نے وجہ زندگی بنا لیا۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی و تہذیبی اسے اپنے آئیڈل انسان کی فکر و عمل سے مرتبط کرلیا۔

ہر مہذب معاشرے کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر و نظر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ تہذیب جہاں انسان کی مادی خوشحالی کی دعویدار ہے وہاں وہ انسانی حقوق میں بھی وسعت کی خواہاں ہے یہ ہر فرد کا حق ہے کہ وہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر سچائی کے راستے کا خود انتخاب کرے۔ کسی پر زبردستی اپنے خیالات تھوپنا انسانی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ جبری زباں بندی کا انجام خطرناک ہوتا ہے۔ قوم کی کمر جھک جاتی ہے اور بقول اقبال اس کے ''سجدے طویل ہو جاتے ہیں'' ''اقتدار کی ''خوشنودی'' اس کا مقصد حیات'' قرار پاتا ہے۔ صاحب نطق و شعور اپنی زندگی کے مادی ذرائع کا خالق ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل حسن آفریں ہوتا ہے جانور کی طرح وہ اپنی جبلت کو نہیں دہراتا۔ بلکہ وہ ہر لمحہ نئی صورت کا جویا اور ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں'' کا متلاشی ہوتا ہے۔ میر انیس نے انہی پہلوؤں کو اپنے انسان کے حوالے سے دریافت کیا اور ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

میر انیس کا کلام ہر دور کے ''ظل اللہ'' کے تصور پر ضرب کاری ہے۔ ''ظل اللہ'' جو تمام انسانوں کو اپنی ''مشیت'' کے تابع کرنا اپنا حق سمجھتا ہے جو ''ارتکاز دولت'' اور ''ارتکاز اختیارات'' کا بے دریغ استعمال کرتا ہے جو اپنے آپ کو اپنے ''محکوم'' سے جداگانہ مخلوق تصور کرتا ہے۔ اگر ''ظل اللہ''

دن کو رات بتائیں تو ارد گرد کے جھوٹی زبان کے پنجروں پر سوار و مسند بردار ستاروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر ''ظل اللہ'' کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ''خون آدم'' کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے نکلنے کا بھی وہ دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔

میر انیس کا کلام اس جمود فکر پر ضرب کاری ہے۔ انہوں نے اپنے 'انسان' کے ذریعے اجتہاد فکر کی راہ دکھائی۔ تاکہ نئی بیداری' نئی روح' نیا نغمہ' نئی نوا سنجی' نئی ضرب کلیم' نئے انداز سے قانون راز ہستی دریافت کر سکے۔

ہر مہذب معاشرہ اپنے دانشوروں اور عالموں کی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ایسے باخبر اور ذمہ دار افراد ہوتے ہیں جن کا اہم فریضہ و ذمہ داری خدا کی طرف سے عطا کردہ نعمت خود آگاہی کو عوام الناس کے قلوب میں راسخ کرنا ہوتا ہے۔ صرف خود آگہی وہ صفت ہے جو جامد کو متحرک کرتی ہے۔ انسان کی توانائیوں کو لوگوں کی مادی زندگی سنوارنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ تاکہ سائنس داں' ادیب' شاعر' معلم' دانشور اور فنکار نسل آدم کے لئے علمی استعداد فراہم کریں۔ تاکہ عوام شعوری طور پر اپنے نصب العین کو ترقی دے کر اپنے وجود کو بہتری اور خود آگہی سے ہم کنار کر سکیں۔

لیکن ہمارے یہاں علم کے میدان میں "Twinkle twinkle little star" کا ''ترانہ'' ابتداء ہی سے بچوں کو ورد زبان کرانے کے نتیجے میں ان کے ننھے ننھے ذہنوں میں اپنی تہذیب و زبان کو حقیر اور مغرب کی زبان و کلچر کو مجرمانہ طور پر بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بچے بڑے ہو کر قابل قدر معاشرتی حیثیت اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنی زمین کی خوشبو' اپنی تہذیب کے حسن اور اپنے عوام کی نفسیات سے اپنے آپ کو بالکل کٹا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ''علیحدگی پسندی'' "Generation Gap" کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اپنے معاشرے کے صاحبان علم و دانش کے علوم سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ کے اردو اور فارسی کلام سے بھی وہ بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بالآخر وہ کسی نہ کسی ''باہر کے ملک'' میں پناہ گیر ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر اور اپنی زمین کی رعنائیوں سے محروم زندگی گزارتے ہیں۔

اجنبی خیالات کی یورش نے ہماری بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ اپنا کھانا' اپنا گانا اور اپنی زبان دنیا کے ہر مہذب معاشرے اور انسان کی کمزوری ہے۔ لیکن ہماری قوم اس سے بیگانہ ہے۔ ہر فرد تنہا' ہر فرد شکستہ اور ہر شخص ذہنی طور پر پراگندہ ہے۔ معاشرہ کنبے کی محبت' بہن بھائی کی محبت' چچا اور پھوپھی کی محبت' دوست اور ساتھی کی محبت' مقصد و مسلک کی محبت' سب

سے بیگانہ اپنے خول میں بند ہے۔ اس کا منکا ڈھل چکا ہے۔ صرف ڈھیری کا لپکا، تعجیل کی پھسلن، خود غرضی کے وسوسے، گمرہی کی ڈھیلی رسی، ہری گھاس چرنے کی ہوس، زندگی کا معمول بن چکا ہے۔ محنت کی عظمت 'معدوم ہے۔ 'بلال' سرمائے کے خونی جبڑوں میں چبایا جا رہا ہے۔ وہ سر تا بقدم لہولہان ہے۔ ''صلح حدیبیہ'' کا پرچم سرنگوں اور 'ایٹمی دھماکے' باعث صد ناز وافتخار ہیں اور جیتی ہوئی جنگ ہارنا موجب ''جشن وچراغاں'' ہیں۔

جشن شکست ہم نے منایا صد احترام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا

صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی ریاست خداداد میں فرزندان توحید گلے میں چھریاں ڈالے ''شیعہ مسجد'' اور ''سنی مسجد'' کے سینے میں نمازیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ 'جوانی' جیسی قیمتی اور بے بہا دولت کو فاقوں کی دہلیز پر آگ دکھائی جا رہی ہے۔ صحافت کی جرات اظہار پابند سلاسل ہے 'عدلیہ کی پشت نیلی اور اس کے بازو رسن بستہ ہیں۔ اساتذہ کرام پر گرم سلاخوں کے شامیانے تنے ہوئے ہیں۔ طلباء اسکول و کالج مانگ رہے ہیں۔ قانون بالادستی مانگ رہا ہے ''معاشرہ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں'' کے کرب سے گزر رہا ہے۔

محنت کے وہ ہاتھ جو قابل تعظیم و تکریم ہوتے ہیں، جن کی انگلیوں

کے پوروں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے اور سارے سماج کو سیراب کرتی ہے۔ آج سندھی، مہاجر، بلوچ، پٹھان، پنجابی کٹھروں میں کھڑی کردی گئی ہے اسے مختلف قسم کی ہیروئن پلائی جارہی ہے تاکہ وہ متحد نہ ہوسکے لیکن اوپر اتحاد بنا رہے کیونکہ نیچے کا اتحاد اوپر کی مٹی کو نیچے اور نیچے کی مٹے کو اوپر کردیتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے کہ ''ہم نے اسے خیر کثیر دیا ہے جسے حکمت دی'' لیکن اسلامی مملکت میں عالموں کی سانسیں چرائی جارہی ہیں۔ ''ابو جہل'' ''محمد عربی'' کو قرآن پڑھا رہا ہے۔ حکمت اور روشن فکری کے معنی صرف کمپیوٹر کی حیرت ناک ایجادات کو سمجھایا جارہا ہے لیکن ان انقلابی رہنماؤں اور مفکرین سے بہر دور ہونا جنہوں نے ماضی میں بنیادی تعمیری تبدیلیوں کی بنیاد رکھی۔ جنہوں نے عوام کو نئے نکتے عطا کیئے۔ جنہوں نے ٹھنڈے، جامد اور سست معاشروں کے لئے سمت عمل، طریق حیات، مطمح نظر اور تقدیر کو بدل دینے کی ترغیب دی۔ اور عملاً ثبوت پیش کیا اس کی جانب نظر نہیں۔ بس ہر چہار جانب عدل سے ''انکار'' نے آگ برسا رکھی ہے۔ درد کی دھار چھوٹ رہی ہے۔ ''حرف حق'' دل میں نیزے کی انی کی بن کر گڑ گیا ہے۔ ہر ''نخل دار'' پر ''سر منصور'' ہے۔ جرات تحقیق بکھری ہوئی ہے۔ فضا تیرگی کی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ بے نور شمعیں، خستہ تن لاشیں ہوس اقتدار کی دہلیز پر بکھری پڑی ہیں۔ نفاق کے سرکش ناتے ٹاپوں سے

گرد اڑا رہے ہیں۔ جیتی جنگ ہارنے کا بگل بجایا جارہا ہے۔ آتشیں رخسار جوان لال سو رہے ہیں۔ ماں اکیلی جاگ رہی ہے۔

ایسی وحشت ناک، جہل افروز، خرد بیزار اور کربناک فضا میں اعتبار بشریت قائم کرنے' اپنے مقدس رشتوں کو پانے' اپنی تہذیب کی اعلیٰ اقدار تک پہنچنے اور 'انسان' بننے کے لئے کیا میؔر و غالب۔ انیس واقبالؒ کے ''انسان کے تصور'' کو نئے انداز اور نئے زاویہ نگاہ سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا میر انیس کے غم واندوہ کے نغموں میں ڈوب کر حقائق کے موتی لانے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیونکہ غم کا یہی وہ نغمہ ہے جس سے میر انیس نے تعمیر حیات کا کام لیا ہے۔ اور اسے شعور میں گہرائی اور سماجی انقلاب برپا کرنے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

موجودہ عہد عظیم الشان تجربات اور نظریات کا عہد ہے۔ شعور برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک طریق فکر' ایک انداز نظر تھوڑی ہی مدت میں پرانا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی فنکار جو اس پیچیدہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا وہ بہت جلد خشک ہو جاتا ہے۔۔ ہاں وہ فنکار جو زندگی کے اسباب و علل پر نگاہ رکھتے ہیں۔ تبدیلی و تغیرات کے محرکات کے آشنا ہیں۔ وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ ان کا تازہ اور جاندار ہونا یہ ہے کہ وہ فوارے کی طرح بلند ہو کر زمین کے درد سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔

اسلئے انکی فکری تازگی موضوع کی گہرائی اور طرز اظہار میں نمایاں ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ انسان ''بشیر''''نذیر''اور''خبیر'' ہے۔ وہی کائنات کی لو، فکر کی جگمگاہٹ اور خدا کی پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن آج یہی انسان سرمائے کے ناگوں کے ہاتھوں کیکر کے درخت پر پڑی ہوئی انگور کی بیل ہے۔ جس کا ہر خوشہ زخمی اور ہر خوشہ لہولہان ہے۔ اسی انسان کو ''گل بداماں'' اور ''چمن بر دوش'' دیکھنے کی تمنا میں تمام عظیم ادیبوں اور مفکروں نے زہر کا جام پیا۔ ''انگلیوں کو فگار'' اور ''دار کو بوسہ دیا'' تاکہ ظلم کی چلچلاتی دھوپ چاندنی میں تبدیل ہو جائے۔ نفرت کے جھکڑ محبت کی باد صبا بن جائیں۔ ''اطاعت شریعت جبر''''تازہ شریعت انکار'' میں بدل جائے۔ جو انسان کو آزادی فکر و نظر و عمل کی نئی قندیل عطا کر دے اور آنسوؤں کو گہر میں تبدیل کر دے۔

میرؔ، غالبؔ، انیس اور اقبالؒ اسی سلسلہ فکر کے عظیم فنکار ہیں۔ اس لئے ان کے 'انسان' کے تصورات کو نہ صرف نت نئے عنوان سے آج پڑھنے کی ضرورت ہے بلکہ اس کے گرد طواف کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ سورج کی طرح، چاند کی طرح، موسموں کی طرح، مدوجزر کی طرح، اسی تکرار کے ساتھ، اسی باقاعدگی کے ساتھ کیونکہ یہی ہے وہ طریقہ جو فانی انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

تہذیبی اقدار اور میر انیس

موجودہ عہد عظیم الشان تجربات کا عہد ہے۔ سماجی تصورات نت نئے عنوان سے نئے سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ دنیا پہلے سے بہت زیادہ سکڑ چکی ہے۔ تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے حالات میں چند بندھے ٹکے میکانکی اصولوں سے کام لے کر ادیب و شاعر کے خیالات تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ وہ روح جو بدلتے ہوئے حالات میں بھی کسی شاعر کو عظمت بخش رہی ہے اس کا سراغ لگانا ضروری ہے۔

میر انیس نے اس عہد میں آنکھ کھولی اور ان کا شعور جوان ہوا جو مخصوص روایات کا حامل تھا۔ معاشی و معاشرتی انحطاط نے جو صورت حال مذہب، فلسفے اور تاریخ میں پیدا کی تھی وہ گنجلک تھی۔ کچھ عقیدے تاریخی حوالے سے فکر پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ جنہیں مختلف ادوار نے جنم دیا تھا۔ رد و قبول کی بہت سی منزلیں آئی تھیں لیکن کوئی نظریہ حیات اس وقت ایسا موجود نہیں تھا جو کسی ایک مذہب، طبقے، گروہ یا مکتب خیال سے وابستہ کیا جا سکتا۔ انگریزوں نے زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ نظریے کی صحت اور غلطی کا دار و مدار انفرادی سوچ پر تھا۔ ماضی سے حال اور مستقبل کا کیا تعلق ہے؟

ادب کے وہ کونسے عناصر ہیں جن کا تحفظ تہذیبی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ ''خیر و شر'' کی قوتیں آپس میں اس طرح گڈمڈ تھیں کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا کرنا تقریباناممکن تھا۔

ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر کے لئے تو یہ ممکن تھا کہ وہ کسی ایک روایت یا عقیدے کا سہارا لے کر اس سے اپنا رشتہ جوڑ لے اور بدلتی ہوئی زندگی اور سماجی قدروں کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہونے والی کیفیات اور سوالات سے منہ موڑ کر گزر جائے لیکن انیس جیسے خلاق ذہن کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ ان کے شعور کا مطالعہ اسی لئے پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔

شاعر و ادیب کا طبقاتی رجحان اس کے فلسفہ حیات کا غماز ہوتا ہے۔ محض کسی ایک طبقے میں پیدا ہو جانا اسے اس طبقے کا فرد قرار نہیں دیتا ہے بلکہ دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کس طبقے کے مفاد کی ترجمانی کر رہا ہے۔ عظیم مفکر لینن کا کہنا ہے کہ ''طبقاتی شعور پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ حاصل کیا جاتا ہے''۔ شعور کے بدلتے رہنے کے عمل کو سمجھ کر ہی کسی شاعر کے شعور اور اس کے حسن نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

میر انیس نے ایک معمولی سے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ پوری زندگی دھرتی کے سینے سے لگ کر گزاری۔ سرد و گرم سے گزرے۔ لیکن پگھلے نہیں۔ بلکہ سونا بنتے گئے۔ ایک طرف چمکتی اور دمکتی ہوئی زندگی دیکھی

دوسری طرف اس کے تلے مرجھائی ہوئی کلیاں بھی دیکھیں۔ ان حالات نے ان کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کیئے۔ زروجواہر کے نیچے دبی ہوئی سلب شدہ قوت احساس کو چھڑانے اور جرات اظہار چھیننے کے لئے انہوں نے "خیر وشر" کے بنیادی نظریے پر غور کرنا شروع کیا۔

ہر دور اپنا نظریہ ساتھ لاتا ہے۔ یہ نظریہ زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اور نئی قدروں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ شکست وریخت کا یہ عمل جاری ہے۔ لیکن نظریے کا جذبات کی بھٹی میں تپنا لازم ہے۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ زمانے کے چیلنج کو قبول کر سکتا ہے۔

ایسا فن جو فکر واحساس میں نظریے کو اتار دے۔ حیات وکائنات کے تسلسل کو واضح کرے۔ سماجی تبدیلی کی خواہش کو بیدار کرے۔ وہ ادراک وآگہی سے مرتب ہوگا۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ اس فن سے مجموعی تصور حیات جو ابھرتا ہے۔ وہ عہد آفریں ہے یا سم قاتل۔ وہ روشنی کی طرف اشارہ کرتا ہے یا جہل کی جانب۔ زندگی کی طرف یہی رویہ یا زاویہ نگاہ کسی بھی فنکار کی عظمت کی پہچان ہے۔

اناطول فرانس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "کوئی ادیب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ نئی بات کہہ رہا ہے۔ دراصل جتنی باتیں کہنے کی ہوتی ہیں وہ سب پہلے ہی کہی جاچکی ہوتی ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے ادیبوں میں صرف تصورات

مشترک ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے انداز میں برتتے ہیں۔"

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

اس منزل پر پہنچنے کے لئے "تیشہ نظر" کی پختگی، ارادے کی صداقت، جذبے کا خلوص، فکری شعلگی، زبان دانی، فنی باریکی، لہجے کی نغمگی اور موضوع پر مضبوط گرفت درکار ہے۔ "خیر و شر" کے تصورات فلسفے اور ادب کے لئے نئے نہیں۔ ادیبوں نے بھی مختلف عنوان سے انہیں ہر سطح پر برتا ہے۔ اور اسے معنی و مفہوم دیئے ہیں۔

واقعہ کربلا کا بنیادی فلسفہ "خیر و شر" پر مبنی ہے۔ اس واقعے کا اثر تہذیبی تاریخ پر بھی پڑا۔ اور یہی وہ تہذیبی اقدار ہیں جنہیں میر انیس نے اپنے "سورنگ" کے انداز سے باندھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خیر و شر کی بنیادی اقدار کو بڑے حلقے تک پہنچانے میں انہوں نے غیر معمولی کردار انجام دیا۔ خیر و شر کی اساسی قدریں نسل انسانی کی "شر" کی جانب لگاوٹ کی وجہ سے ہمیشہ "خطرے" میں رہتی ہیں اور بعض فنکاروں کے یہاں ناپختگی نظر یا کسی اور وجہ سے احترام و تقدس بھی حاصل کرلیتی ہیں۔

ھومر، فردوسی اور دانتے ہی کی مثال لیجئے۔ ھومر نے یونانی دیوتاؤں کے قصے سنائے ہیں۔ ان یونانی دیوتاؤں کا کذب بیانی، دھوکے بازی، سازش

اور نقض عہد وغیرہ جیسے انسانی جرائم کے بارے میں جو مجرمانہ طرز عمل اور انداز زندگی ھومر نے بیان کیا ہے اسے اخلاقی اقدار کے سب سے بڑے مبلغ سقراط کے شاگرد رشید افلاطون نے اتنا برا خیال کیا کہ ایک تو ۱۸ سال کی عمر میں اپنی ساری شاعری کو آگ لگادی اور دوسرے یہ طے کر دیا کہ کسی شریف معاشرے میں شعراء کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ افلاطون کی مثالی ریاست میں شاعر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

افلاطون نے یہ فیصلہ ھومر اور دوسرے ان یونانی شعراء کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد دیا تھا جو دیوتاؤں کے انداز میں پیش کر کے جرائم پسندی کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ افلاطون کو یہ خیال بھی نہ گزرا ہوگا کہ شاعری سے ''خیر و شر'' کی اساسی قدروں کو مقبول و محترم بنانے کا وہ کام بھی لیا جا سکتا ہے جو انیس نے لیا ہے۔ اگر افلاطون میر انیس کی شاعری سن لیتا تو نہ صرف یہ کہ وہ ان کو اپنی مثالی ریاست میں داخل ہونے کی اجازت دیتا بلکہ شاید انہیں محکمہ اخلاق عامہ کا نگران بھی مقرر کر دیتا اور شاید قران بھی شعراء پر لگائے ہوئے الزامات کو واپس لے لیتا۔ اس لئے کہ انیس نے خیر و شر کی اساسی قدروں کو محبوب بنانے کے لئے ''خیر و شر'' کو ذکاوت کی بھٹی میں اس طرح پگھلایا کہ ''خیر و شر'' علیحٰدہ علیحٰدہ نظر آنے لگے۔

پر سوچ لو، مانع کوئی غدار نہ ہوئے
وہ کیجیے، جس بات میں تکرار نہ ہوئے

☆

ہے پاس نبی، ہاتھ نہ قبضے پہ دھریں گے
امت جو ستائے بھی، تو ہم صبر کریں گے

☆

نفرین کرے، ابن علی کا نہیں یہ کام
ہم کرتے ہیں امت کی دعائیں سحر و شام

☆

یزیدی لشکر کا سردار حر پانی کا طلب گار ہے:

منہ دیکھ کے فرمانے لگے شاہ خوش اقبال
کیا وجہ جو تم لوگ ہو سب مضطرب الحال؟
تب عرض یہ کی حر نے کہ "اے فاطمہ کے لال!"
بے تاب ہیں سب ماہی بے آب کی تمثال
آہوں کا دھواں اٹھا ہے پیاسوں کے جگر سے
قطرہ نہیں پانی کا ملا تین پہر سے

"خیر" کا ماہ تمام، صدائے تیشہ حق کا شناسا۔ بساط اخلاق بسیط کرنے کا جویا یوں شبنم ریز ہے۔

یہ سنتے ہی بے تاب ہوئے سبط پیمبر
دیکھا رخ عباس کو اشک آنکھوں میں بھر کر
فرمایا کہ "یہ لوگ ہیں سب پیاس سے مضطر"
جو ساتھ ہے پانی' ابھی منگواؤ برادر!
بھیا! کمر اب کھولیو' پیاس ان کی بجھا کے
"میں کانپ رہا ہوں' کہ یہ بندے ہیں خدا کے"
آہستہ یہ کی عرض کہ "اے کل کے مددگار
کیا طاقت و قدرت جو کروں حکم میں تکرار
پر مصلحتہً عرض یہ کرتا ہے نمک خوار
اطفال ہیں' ساتھ آپ کے' یا سید الابرار!
مولا! کئی فرسخ ابھی جانا ہے یہاں سے
مانگیں گے وہ پانی' تو پھر آئے گا کہاں سے؟
فرمایا "مرے سر کی قسم' کچھ نہ کہو اب
میری یہی مرضی ہے کہ سیراب ہوں یہ سب
انسان کا انساں سے روا ہوتا ہے مطلب
مر جائیں مسلماں! یہ گوارا ہے مجھے کب
میں مالک کوثر ہوں' تردد تمہیں کیا ہے
پیاس ان کی بجھا دو' مرے بچوں کا خدا ہے

"خیر و شر" کی قوتوں کو شاعر یوں ابھارتا ہے:

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں
مجھ کو پہچانو، کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے، نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں، کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے، آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں، کچھ صبر اسے کہتے ہیں

ہاتھ آئے گا نہ انعام، نہ زر پاؤ گے
"یاد رکھو مرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے"
نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر
حجت اللہ کے فرزند پہ آنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر
"لو خبردار! چمکتی ہے علی کی شمشیر!
پسر فاتح صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو کہ حسین آتا ہے

تھم گئے سن کے یہ آواز شہ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ "حاضر ہے یہ سر"

عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانی شر
شمر اظلم ہے کدھر، کھینچ کے آئے خنجر
ہے وہ عاشق، جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس، مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

کربلا کا واقعہ میر انیس کا موضوع ہے۔ یہ خوش قسمتی ہے میر انیس کی کہ انہیں ایک ایسے واقعے کو اپنا موضوع بنانے کا موقع ملا کہ جس میں انفرادی، مجلسی، اجتماعی اور سماجی زندگی کے ایسے رشتوں، تعلقات اور روابط کو بتانے اور شعری انداز میں ڈھالنے کی سہولت حاصل رہی جو انسانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو گھیر لیتے ہیں۔ ان روابط کے بیان میں اخلاقی قدروں کا تقاضا کیا ہے اس پہلو کو میر انیس جیسے ہیرے کی طرح تراشے ہوئے فنکار نے اپنی حیرت انگیز ذہانت اور فنی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اور یوں انیس کی شاعری نے بنیادی اخلاقی قدروں کو پھیلانے اور مقبول بنانے کے سلسلے میں جو کام کیا ہے تاریخ ادب میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

ھومر کے بعد اب دانتے کو لیجیے۔ دانتے نے ڈیوائن کامیڈی "Divine Comedy" میں اچھائی اور برائی کا معیار مذہب اور عقیدہ رکھا ہے۔ ہر وہ شخص جو عیسائی نہیں ہے جہنم میں ڈال دیا گیا ہے۔ دانتے نے

افلاطون، ارسطو اور مسلمانوں کی مقدس شخصیتوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ اس قسم کے خیالات سے اخلاقی قدروں کا احترام نہیں بڑھتا بلکہ بنیاد پرستی کے رجحان کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر دانتے کے ہیرو اور ویلین اپنے کردار کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف ایک عقیدے کی وابستگی کی بناء پر اہمیت اور عزت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ لیکن میر انیس اپنے ہیرو یا ویلین کی عقیدت یا بد عقیدتی کے ذکر پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ان کے کردار اور اعمال کا تفصیل سے ذکر کر کے محبت یا نفرت، احترام یا عداوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ انیس نے مظلومیت اور ظلم کو ایک اساسی پیمانے کے طور پر رکھا ہے وہ اسی پیمانے سے اپنے ہیرو یا ویلین کو ناپتے ہیں اور اس سے محبت یا نفرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

زاری تھی، التجا تھی، مناجات تھی ادھر
واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر
کہتا تھا ابن سعد یہ جاجا کے نہر پر
گھاٹوں سے ہوشیار، ترائی سے باخبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسین کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسین کو

دانتوں میں زبان داب کے حضرت نے کہا "ہا!"
ہم حجت حق ہیں، ہمیں سبقت نہیں زیبا
تھوڑوں کو اگر قتل کیا ہم نے، تو پھر کیا؟
جب آئیں گی فوجیں، تو سمجھ لیویں گے، اچھا
بولیں گے نہ کچھ، تن پر اگر تیر پڑیں گے
ایسا ہی ستائے گی جو امت، تو لڑیں گے

یعنی میر انیس کے یہاں "خیر و شر" کا تصور اور ان اقدار کی اہمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس لئے انیس "خیر و شر" کی اساسی قدروں کو بڑھانے یا پھیلانے میں جو کردار انجام دیتے ہیں وہ دوسرے کسی بھی شاعر سے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

مرثیہ گو شعراء نے عموماً اور میر انیس نے بالخصوص ظلم و مظلومیت کی دوئی پر بڑی شدت سے جو زور دیا ہے وہ سماجی اور سیاسی اہمیت کی بھی حامل ہے۔ چنانچہ ظلم دشمن احساسات میں پختگی اور ہمہ گیری پیدا کرنے کے اس عمل نے برصغیر کے بہت سے نوجوانوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اور وہ اپنی معاصر زندگی کے سکون کو ظلم اور مظلومیت کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے لگے اور یوں ذی شعور نوجوانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد "خیر و شر" کی اساسی قدروں سے متاثر ہو کر سیاسی انقلابیت پسندی کی حامی ہو گئی۔ میر انیس کی

شاعری کا یہ سیاسی و انقلابی اثر خاص طور پر توجہ طلب اور مزید جائزے کا تقاضہ کرتا ہے اس لئے کہ انیس نے مرثیہ گویوں کے سرخیل کی حیثیت سے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ دوررس اثرات کا حامل ہے۔

ھومر اور دانتے کی طرح فردوسی کے ہیرو بھی اخلاق انسانی کے بلند اقدار پر پورا نہیں اترتے بلکہ بعض اعتبار سے تو پست درجے کے افراد نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان کی خوبی جسمانی طاقت کی برتری اور اس کی نمائش ہوتی ہے فردوسی کا ویلین ایک قد آور شخص ہوتا ہے جو مال کار جسمانی طاقت کے مقابلے میں ہار جاتا ہے۔ لیکن انیس جسمانی خوبیوں کو اس طرح نمایاں اہمیت نہیں دیتے اور اس لئے وہ فردوسی سے مختلف انداز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

میر انیس نے ''خیر و شر'' کی اساسی انسانی اقدار کے سلسلے میں جو تاریخی کردار انجام دیا ہے ادب کی پوری تاریخ میں اس کی دوسری کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔

میر انیس کی دوسری قابل ذکر اور بڑی حد تک اختصاصی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مراثی میں کربلا کے پورے واقعے کو ایک ایسے ثقافتی فریم میں پیش کیا ہے جو بر صغیر کے سماجی و مجلسی حالات سے بنا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تمام مرثیہ گو شعراء خاص طور پر میر انیس بر صغیر کی اس

ثقافت کے بہت بڑے امین اور مبلغ ہیں جو مختلف کیفیتوں، حیثیتوں اور نوعیت
میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں پائی جاتی ہے۔ یہ ثقافتی مرکب جو
برصغیر میں پایا جاتا ہے یہ ایک طرف عرب تہذیب اور دوسری طرف آریائی
ثقافت کے باہمی تصادم اور ملاپ سے پیدا ہوا ہے۔ عرب تہذیب سے مراد
یہاں عرب ملکوں کی تہذیب نہیں ہے جس سے مثلاً ایران اور افغانستان کو
الگ کیا جاسکے بلکہ مراد اس تہذیب سے ہے جو عرب علاقوں میں پیدا ہوئی۔
اور ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک افغانستان سے لے کر ترکی اور شمالی
افریقہ کے مسلم ممالک نیز دوسرے اسلامی ممالک میں موجود رہی۔
یہ تہذیب جب ہندوستان آئی تو اس کا قدیم ہندوستانی تہذیب سے جو اپنی
جگہ ایک بھرپور، شاندار اور ہمہ گیر تہذیب تھی تصادم بھی ہوا اور ملاپ بھی
اور اس کے نتیجے میں ایک نیا تہذیبی نمونہ برصغیر کے نئے ثقافتی ارتقاء کی
شکل میں رونما ہوا۔ یہ کائناتی نمونہ، فرد اور خاندان اور قبیلے کے تمام رشتوں
شادی و موت، نشست و برخاست، انفرادی تعلقات، باہمی رشتوں، رواسم و
رواج، تہذیبی تکلفات، مجلسی آداب، زبان و بیان، طرز گفتگو، انداز تخاطب،
رشتوں کی نزاکتوں، تعلقات کی باریکیوں، غرض حیات و کائنات کے تمام
گوشوں اور فرد و اجتماع کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھا۔

اس ثقافتی نمونے میں عرب کا کھردراپن، ایران کی نفاست اور

دقت پسندی اور ہندوستان کی رومانیت اور نرم روی، سب ہی کا حصہ تھا۔ اس بھرپور ثقافتی نمونے کو جس ایک شاعر نے اپنے کلام کے ذریعے تاریخ و ثقافت میں محفوظ کر دیا ہے وہ میر انیس ہے۔

برصغیر یا جنوبی ایشائی تہذیب کے نادر نمونے میر انیس کی شاعری میں نگینوں کی طرح یوں جڑے ہوئے ہیں۔

خیمے میں جا کے شاہ نے دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں، اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے رب ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

دوسرے مقام پر اسی تہذیب کا دوسرا پہلو یوں سامنے آتا ہے:

یہ سن کے آئی زوجہ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبط مصطفیٰ کی بلائیں بہ چشم تر
زینبؑ کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
"فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑی کنیز کی، رتبہ غلام کا"

سر کو لگا کے چھاتی سے زینبؓ نے یہ کہا
"تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے صدا"
کی عرض "مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں، تو فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جئیں ترقی اقبال و جاہ ہو
سائے میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو
قسمت وطن میں خیر سے پھر سب کو لے کے جائے
یثرب میں شور ہو کہ "سفر سے حسین آئے"
ام البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے
جلدی کہیں عروسی اکبر خدا دکھائے
مہندی تمہارا لال رچے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

عرب کلچر دجلہ و فرات کے کناروں پر اب سے کوئی دس یا گیارہ ہزار سال پہلے وجود میں آیا تھا اور خیال یہ ہے کہ دنیا کے سارے قدیم کلچر کسی نہ کسی حوالے سے اس تہذیبی رویے سے متاثر ہوئے تھے جو دجلہ اور فرات کے کناروں سے چلی تھی۔ آپ ویدوں کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وحدانیت کا تصور، بہشت کا خیال، سزا و جزاء کا وہ تصور جو حیات بعد الممات کے بعد عملی جامہ پہنے گا یعنی جو تناسخ کے تصور سے مختلف ہے۔ بلکہ پل

صراط کا ہلکا سا تصور بھی ویدوں میں موجود ہے۔ اتنا ہی نہیں ایک ایسے طوفان کا ذکر بھی ان قدیم ہندوستانی صحائف میں موجود ہے جو واضح طور پر طوفان نوح ہے اس لئے کہ اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اس کلچر کا جائزہ لینا ہو تو اس کے ان گنت پہلوؤں کو جن دو بڑی کتابوں نے اپنے اندر میں سمو لیا ہے وہ ابو الفرج اصفہانی کی کتاب ''الآغانی'' اور علامہ مجلسی کی ''بحار الانوار'' ہے جسے تین سو علماء کے ایک بورڈ نے جس کے صدر مجلسی تھے مرتب کیا تھا۔ ''بحار الانوار'' میں یہاں تک ملتا ہے کہ عرب تہذیب اپنے توہمات کے ہجوم میں کس طرح خواب دیکھتی تھی۔ تہوار' ایام نحس و سعد' کائناتی تصور' حیات و ممات' انفرادی و اجتماعی زندگی اور اس کی ساری باریکیاں اس کتاب کے مطالعے سے سامنے آسکتی ہیں۔ ''الآغانی'' میں بعض دوسرے بھی پہلو بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں اور اس لئے اس کی اہمیت اور قیمت بھی غیر معمولی ہے۔

برصغیر کی عرب آریائی ثقافت کے سلسلے میں یہ کام میر انیس کے علاوہ ''طلسم ہوشربا'' کے مصنفوں اور کسی حد تک نظیر اکبر آبادی نے انجام دیا ہے جن کے مطالعے سے اس ثقافتی نمونے کے تقریباً تمام خدوخال نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ جدید ناول نگاروں خصوصاً منشی پریم چند اور قرۃ العین حیدر نے بھی یہ کام بڑی توجہ سے کیا ہے لیکن میر انیس کا مطالعہ اتنا

وسیع اور ان کا کینونیس اتنا ہمہ گیر ہے کہ دوسرے اس باب میں ان سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

ارسطو کی بوطیقا نامکمل حالت میں ہمارے سامنے ہے۔ ارسطو کے پورے موجود ادب کے مطالعے کے بعد جو دہشت اور احترام اس غیر معمولی ذہانت کے مفکر کی بابت ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بوطیقا کے ضائع شدہ حصوں میں شاعر کے انفرادی تجربے کی اہمیت کا ذکر ارسطو نے ضرور کیا ہو گا۔ تاہم بوطیقا کے موجودہ اجزاء میں شاعری کی جو تعریف پائی جاتی ہے اس میں کائنات کی نقالی یا ہو بہو تصویر کشی کو شعر کی صحیح تعریف ارسطو نے قرار دیا ہے۔ بلکہ ہو بہو تصویر کشی کی بات میں ذرا سی ترمیم مناسب ہو گی اس لئے کہ ارسطو نے اس بات کی اجازت بھی دی ہے کہ واقعات کے تاثر کو بڑھانے کے لئے قدرے مبالغے کی اجازت بھی فنکار کو دی جانی چاہیئے۔ شاعری کی یہ تعریف ھومر اور دوسرے ڈرامہ نگار شعراء کو دیکھ کر کی گئی تھی چنانچہ بوطیقا یا پوئے ٹیکس میں بار بار انہی کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

ارسطو کی اس تعریف پر پرکھا جائے تو میر انیس صف اول کے شاعر قرار دیئے جائیں گے۔ ارسطو کے سامنے انیس کی شاعری ہوتی تو وہ ھومر سے زیادہ بلند درجے پر میر انیس کو بٹھاتا۔ اس لئے کہ انیس ڈرامہ نگاری کے

معاملے میں ہومر پر فوقیت رکھتے ہیں۔

ادب کا مقصد Images کے ذریعے حقیقت کی مصوری کر کے لوگوں کو متحرک، ان کی نفسیات کو منظم، ان میں مستقبل کا تعین اور عمل کا جذبہ بیدار کرنا ہوتا ہے۔ شاعر فوٹوگرافر نہیں جو بس اصل کی نقل اتار دے۔ بلکہ انسانی رشتوں کی فوٹوگرافی، کسی انسان کے رد عمل کے طریق و تسلسل کو پیش کرنا۔ سماجی تعلقات اور انسانی ذہن کی کیفیات کی مصوری کرنا اس کا کام ہے۔

انیس نے ڈرامائی کردار نگاری کے ذریعے یہ اہم کام انجام دیا ہے۔ ڈرامائی کردار نگاری یہ نہیں ہے کہ آپ چند منتخب خصوصیات کو محسوس کریں بلکہ یہ ہے کہ آپ کردار کی مکمل شخصیت کو مسلسل جدوجہد کے تناظر میں پیش کریں۔

میر انیس نے جو ڈرامائی کردار نگاری کی ہے اس کی مثال اردو ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ صرف ایک نقشہ ملاحظہ ہو خیمے سے علم کے نکلنے کی دھوم ہے اسے دیکھ کر جناب زینب کے بچوں کی خوشی، تمنا اور حسرت جاگ اٹھی ہے۔ بچپن کی معصومیت انہیں یقین دلا رہی ہے کہ چونکہ یہ جعفر

طیار کے پوتے ہیں اس لئے علم کے حقدار بس یہی ہیں :

تیغیں کمر میں، دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آکھڑے ہوئے
گہ ماں کو دیکھتے تھے، کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ "نثار شہ امم"
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں، کسے ملے گا علم نانا جان کا

ڈرامائی کردار نگاری یوں آگے بڑھی ہے۔

زینبؑ نے کہا پیارو تمہیں اس سے کیا ہے کام؟
کیا دخل مجھ کو؟ مالک و مختار ہیں امام
دیکھو، نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں، جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ، بس، کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے؟
سرکو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس

بس، قابل قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے پھر، جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچنے کے سوا اور کیا کہوں؟

یادوسرے مقام پر انتہائی ڈرامائی لہجے میں یہ دو مصرع کہے۔ باپ جنگ کے دوران بیٹے کو کس طرح یاد کررہا ہے۔

"تم نے نہ دیکھی جنگ پدر، اے پدر کی جاں"

بیٹی کی خواہش ہے کہ باپ صرف اسی کو چاہے۔ اس کیفیت کو کس ڈرامائی انداز میں ادا کیا ہے۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں یہ اماں کے پسر ہیں

شاعری کا وہ عنصر جسے بڑا حلقہ شاعری کا جوہر کہتا ہے۔ وہ انفرادی تجربہ ہے جس سے شاعر خود گزرتا ہے۔ ارسطو نے بوطیقا میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس اعتبار سے ھومر، فردوسی اور میر انیس ایک مختلف طبقے کی شخصیت قرار دیئے جائیں گے۔ اس پیمانے پر انہی کو پرکھنا چاہیئے۔ نہ ھومر کو اور نہ فردوسی کو۔ البتہ دانتے جو مذہبی جذبے میں سرشار ہے کسی حد تک اس صف کے شعراء میں شامل ہے۔ مطلب یہ کہ غالب، میر تقی میر اور میر انیس کے فن میں جوہری فرق ہے۔ البتہ اقبالؒ دونوں گروہ میں کسی نہ کسی درجے میں ضرور شامل کیئے جاسکتے ہیں۔

میر انیس شعراء کے جس گروہ میں شامل ہیں اسے سچے فنکاروں کا طبقہ قرار دینا چاہیئے۔ شاعری بطور فن کے انیس میں مجسم ہو کر سامنے آئی ہے۔ فن شاعری کچھ قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے۔ ان قواعد و ضوابط کو اپنی شاعری میں بطرز احسن اور بدرجہ کمال جس شخص نے تاریخ و ادب انسانی میں آج تک استعمال کیا ہے وہ میر ببر علی انیس ہیں۔

دوانی نے ایک کتاب "مطول" کے نام سے لکھی تھی جس میں فن شاعری کو اپنی تمام اقسام اور پہلوؤں کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ فن شاعری موضوع کے ساتھ مال کار بلاغت کا فن ہے جس میں فصاحت بھی شامل ہے۔ دوانی نے بلاغت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کوئی پہلو ایسا نہیں جسے چھوڑ دیا ہو۔ ایک بڑی طویل اور ضخیم کتاب ہے جن میں استعارات، تشبیہات، صنائع اور بدائع کا کوئی پہلو، کوئی انداز نظر انداز نہیں کیا گیا۔

دوانی کی فصاحت و بلاغت پر یہ جامع کتاب اگر کہیں عملی اطلاق حاصل کر سکی ہے تو وہ صرف اور صرف میر انیس کا کلام ہے۔ تمام صنائع و بدائع میر انیس کے کلام میں ملتے ہیں۔ صفت واسع الشفتین ہو یا واصل الشفتین۔ استعارہ ہو یا تشبیہ یا کنایہ۔ لف و نشر مرتب ہو یا غیر مرتب۔ کلام نقطتین ہو یا غیر نقط شاعری۔ تجنیس خطی ہو یا تجنیس معنوی۔ غرض کوئی صنع یا

بدیعہ ایسا نہیں کہ انیس کے کلام سے اس کی مثال پیش نہ کی جاسکتی ہو۔

انیس کا یہ اختصاص ایسا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس معاملے میں ان کا مدمقابل نظر نہیں آتا۔ دوسرے مرثیہ گو شعراء بھی اس باب میں انیس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ دبیر کے یہاں بھی بلاغت کا بڑا حصہ موجود ہے لیکن دبیر فصاحت کے میدان میں انیس سے طے شدہ طور پر پیچھے ہیں اس لئے انیس کی اولیت اس اعتبار سے بھی مسلم ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

باڑھ وہ باڑھ کہ بہتا ہوا دھارا جیسے
کاٹ وہ کاٹ کہ دریا کا کگارہ جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

معنی کا بھی یہ حال ہے حسن قبول سے
خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

لفظوں میں یوں ہے معنی روشن کی آب و تاب
جس طرح عکس آئینے میں، جام میں گلاب

سینے کا آئینہ ہے، کہ نور خدا کا گھر
یا وہ مدینہ علم کا، حیدر ہیں جس کا در
اس صدر میں بھرے ہوئے ہیں راز کے گہر
آئندہ و گذشتہ کی سب ہے انہیں خبر
پنہاں جو دل میں ہے، اسے پہچانتے ہیں یہ
جو بے زباں ہے، اس کی زباں جانتے ہیں یہ

اگلی صفیں الٹ گئیں یوں پچھلی فوج پر
طوفاں میں موج گرتی ہے جس طرح موج پر

بھاگڑ میں خاک اڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ "زمین بھی سرک گئی"

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
تیرگی بد ہے، مگر نیک ہے گیسو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
زیب ہے خال سیاہ چہرہ گل رو کے لئے
دانا آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

صف میں ہوا جو نعرہ قد قامت الصلواۃ
قائم ہوئی نماز' اٹھے شاہ کائنات
وہ نور کی صفیں' وہ مصلّیٰ ملک صفات
قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات
جلوہ تھا تابہ عرش مصلّیٰ حسین کا
مصحف کی لوح تھی' کہ مصلّیٰ حسین کا

قرآں کھلا ہوا' کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو' یوں تھے شہ حجاز تھے
سطریں تھیں' یا صفیں عقب شاہ سرفراز
کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

ہاتھ ان کے جب قنوت میں اٹھے سوئے خدا
خود ہوگئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان' ہلا عرش کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائر دعا
وہ خاکسار محو تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

یوں کئی اعتبار سے انیس تہذیب وادب انسانی میں ایک بے مثال اور بے نظیر شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ادب میں اونچائی، مضبوطی اور پاکیزگی کا جو مقام حاصل کیا ہے شاید ہی کوئی دوسرا اس کی سرحد کی بلندی کو چھو سکے۔

میر انیس نے قصیدے سے شکوہ الفاظ، مثنوی سے بیانیہ طرز، تازگی ودلآویزی، غزل سے غنائیت اور سوز و گداز زندگی سے ہمہ جہت بصیرت حاصل کی اسی کے ساتھ ترقی ورجعت، رواداری و مذہبی تنگ نظری، لسانی عصبیت اور قومی ہم آہنگی، جنگ اور امن و سلامتی، غرضیکہ غور و فکر، انقلابی شعور، نئی آگہی اور نئی فضا کی اتنی معنی خیز اور فکر انگیز جہتیں کھول دیں کہ ان کا ہر نقش پا چراغ راہ گزر بن گیا۔ جو بھی ان کے پاس سے گزر گیا وہ پارسا بن گیا۔ اور جس نے انکار کیا وہ کافر ٹھہرا۔

میر انیس نے ادب کی دنیا میں ایک ایسا گلشن کھلایا ہے جس پر خزاں کا ہاتھ کبھی نہیں پہنچ سکتا۔

لہجہ اور بھاؤ

انیس کے فن کے دو اہم عناصر

میر ببر علی انیس نہ مسدس کے موجد ہیں۔ نہ مرثیہ گوئی کے، نہ تحت اللفظ خوانی کی ابتدا ان سے ہوئی نہ مرثیہ خوانی کی۔

میر ببر علی انیس موجد ہیں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک وحدت ایک اکائی میں تبدیل کر کے ایک نیا فن تخلیق کرنے کے انہوں نے واقعات کربلا کو ڈرامائی رنگ، زبان کو انداز تکلم اور لہجے اور تحت اللفظ کو بھاؤ سے بنا سنوار کر مرثیے کو فن کی اس بلند سطح پر پہنچایا جسے ڈرامہ کہتے ہیں۔ ڈرامہ جو ادب، کردار نگاری، اداکاری، سنگیت اور عزت کا ایک حسین امتزاج ہے اور انسان کی تخلیقی ریتے کا اعلیٰ ترین شاہکار۔

بس اے انیس روک لے اب خامہ کی عناں
یہ غم ہے چاں گزا نہ کبھی ہوئے گا بیاں
آنکھوں سے سامعین کے بھی اشک ہیں رواں

(جب ان میں سر بلند)

یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار
رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسم زار

سامعین جلد لہجہ لیں جسے ضرورت ہے وہی۔ (جب فاتحہ تخیر ہوا)

(نمک خوان تکلم)

لیکن یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انیس سے پہلے بھی مرثیہ گو مرثیہ پڑھنے کے لئے ہی مرثیہ لکھتے تھے۔ ہاں نئی بات یہ تھی کہ اب تک مرثیہ گو صرف مرثیہ پڑھنے کی حد تک لہجہ استعمال کرتے تھے۔ انیس کے مرثیہ کو انداز تکلم دے کر لہجے کو اس کا بنیادی عنصر بنا دیا۔ لہجہ ان کے یہاں صرف اسٹائل نہیں۔ معنی آخر نئی اور مختلف قسم کے کرداروں کے تنوع اور مزاج کے اظہار کا طریقہ ہے۔

لہجہ :۔

لہجہ کیا ہے؟ جب ہم بولتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں تو آواز کی ایک وسطی سطح ہوتی ہے اور گفتگو کے وقت ہماری آواز وسطی سطح سے اوپر اور نیچے ہوتی رہتی ہے۔ یعنی ہم سپاٹ طور پر بات نہیں کرتے بلکہ آواز کا سر کبھی اوپر جاتا ہے کبھی نیچے آتا ہے اور کبھی وسطی سطح پر آجاتا ہے۔ موسیقی میں اس کا اصطلاحی نام زیر و بم ہے۔

اگر کسی گائک کے سامنے کسی راگ یا راگنی کے میوزیکل نوٹیشن

رکھ دیئے جائیں تو وہ انہیں کس طرح پڑھے گا؟ سپاٹ طریقے سے سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ یعنی لکھے ہوئے سر دہرائے گا۔ جیسے ریڈیو کا اناؤنسر کہتا ہے۔ اب آپ خانصاحب سے راگ ایمن کلیان میں ایک رچنا سنیں گے۔ جس کے بول ہیں۔ ''آل نبی اولاد علی پرواری واری جاؤں'' یا نوٹیشن کے اشاروں کو ان کے صحیح مقامات پر ادا کر کے ایمن کلیان کا روپ نکھارے گا۔ ظاہر ہے وہ ہر شے ء کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر ہی نوٹیشن پڑھے گا۔ اگر کوئی سر اپنے مقام سے ہٹا تو گویا بے سرا ہو جائے گا اور بول کی صحیح ادائیگی کے باوجود راگ کی شکل بگڑ جائے گی۔ انیس کے مرثیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے یہاں بے شمار مقام ایسے آتے ہیں کہ اگر ہم بند یا شعر یا مصرع کے لہجے کو سمجھ لیں تو ان کو صحیح طور پر پڑھ ہی نہیں سکتے۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شعر ناموزوں پڑھیں گے۔ لیکن اس شعر یا بند میں انیس کہنا کیا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری گرفت میں نہ آسکے گا۔

لہجہ بہ آواز بلند ادا کرنے اور سننے کی چیز ہے۔ یعنی انیس کو صحیح پڑھنے کے لئے بہ آواز بلند پڑھنا ضروری ہے۔

لہجہ سنو زبان فصاحت نواز کا۔ تار نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا

دوسری بات۔:۔

ایک ہی زبان بولنے والوں کے لہجے میں فرق ہوتا ہے جس کا تعلق

تعلیم، علاقے، پیشے، طبقے، جنس وغیرہ سے ہوتا ہے اور اس لہجے کے ساتھ ہر حلقے کے کچھ مخصوص الفاظ ہو جاتے ہیں۔ جن کا مفہوم ان کے لغوی معنی سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کی بیگمات کا لہجہ اور زبان، دہلی کے کرخنداروں کی زبان اور لہجہ، اودھ کے قصباتی شرفاء کی زبان اور لہجہ، پرانے لکھنؤ کے شرفاء کا لہجہ وغیرہ وغیرہ۔ انیس کے یہاں یہی مختلف کرداروں کے لہجے الگ الگ ہیں۔ جن کا انحصار ان کی عمر، جنس، رتبے وغیرہ سے ہے۔

تیسری بات :۔

یہ صحیح ہے کہ تقریباً ہر شخص بات کرتے وقت کوئی نہ کوئی لہجہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی ڈرمہ نگار مکالموں میں کوئی خاص لہجہ استعمال کر کے کوئی خاص بات کہتا ہے تو پڑھنے یا مکالمہ بولنے والا اس لہجے کی تہہ تک پہنچنے اور اسی لہجے میں اسے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے یا ایسا کرنا چاہے۔ یہی بات انیس کے ان اشعار یا بندوں پر عائد ہوتی ہے جن کو کسی خاص لہجے میں لکھا گیا ہے۔ کوئی خاص شعر یا بند انیس نے کس لہجے میں لکھا تھا یہ بتانے والا تو اب کوئی ہے نہیں۔ اس لئے پڑھنے والے پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس مصرع یا شعر یا بند کے سیاق و سباق پر نظر ڈال کر وہ لہجہ دریافت کرے جس سے شاعر کا ماضی الضمیر لہجہ میں آسکے۔

یہیں سے متن کی تاویل، تفہیم اور تعبیر میں اختلاف بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ شکسپیر کے ڈراموں کو سٹیج اور اسکرین پر پیش کرنے والوں کے درمیان بے شمار مقامات پر تاثیل اور تعبیر کے اختلاف ہیں۔ ہیلٹ کے To be or not to be that is the question. کو مختلف ڈائریکٹروں اور ایکٹروں سے الگ الگ طریقے سے پیش کیا ہے۔ کسی کے یہاں یہ زیر لب خود کلامی ہے۔ جس میں زندگی کے معنی کی جستجو ہے۔ تو کسی کے یہاں یہ ایک کمزور اور پراگندہ ذہن کی شکست خوردگی ہے۔ انی سکے یہاں بھی ایسے بہت سے مقام آتے ہیں۔ جن کی الگ الگ تاویلیں اور تعبیریں ہو سکتی ہیں۔اور یہ اختلاف ہیں اس لہجے یالفظ کے مزید پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔

لیکن تعبیر و تاویل کے اس اختلاف سے قطع نظر پہلے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ خود مرثیے کے اندر لہجے کی موجودگی کیا ہے اور یہ ہمارے سامنے کس قسم کے لہجے پیش کرتی ہے۔ انداز گفتگو کا ایک سادہ سا لفظ ہے "تو"۔ لیکن یہی سادہ سا لفظ الگ الگ لہجوں کو کس طرح متعین کرتا ہے اس کی کچھ مثالیں میر انیس کے یہاں دیکھئے۔

امام حسین دشمن کی فوج کو بہت کچھ سمجھاتے ہیں کہ جو کچھ کر رہے ہو برا کر رہے ہو۔اب یہی وقت ہے اپنی حرکتوں سے باز آؤ لیکن جب

تقریر کا بھی فوج مخالف پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو کہتے ہیں۔

چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر
تو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر

پسر فاتح صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو کہ حسینؑ آتا ہے

اس تو میں ایک چیلنج ہے۔ کہنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ تمہیں بہت کچھ سمجھایا لیکن تم سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو تو اب میری تلوار کے سامنے ٹھہر سکتے ہو تو ٹھہرو۔

لیکن اب مرثیہ نگار خود راوی بن جاتا ہے۔ اس منظر کو دیکھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

تو نے کھینچی تیغ وہ سر فوج پہ آفت آئی
تو ہلا فاتحہ عرش قیامت آئی

راوی کو احساس ہے کہ اگر امام حسین نے تلوار کھینچ لی تو کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ وہ انتظار کر رہا ہے کہ اس ڈرامائی تصادم کا انجام کیا ہوگا اور اب جبکہ امام نے تلوار کھینچ ہی لی تو خود راوی پر اس کا رعب اور دبدبہ قائم ہو جاتا ہے۔

اسی لفظ تو کی ایک دوسری شکل دیکھئے۔ جس میں بہ یک وقت جذبہ حقارت بھی ہے۔ اور جھنجھلاہٹ بھی۔ ابن سعد حر کو طعنے دیتا ہے کہ شاید امام حسین کی تقریر کا تجھ پر بہت اثر ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دھمکی بھی دیتا ہے کہ اگر تیرا یہی حال رہا تو اوپر سے عتاب نازل ہو گا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ حر کے غصے کا پارہ بتدریج بڑھ رہا ہے اور آخر وہ منزل آن پہنچتی ہے جس سے آگے وہ اب اور کچھ برداشت نہیں کر سکتا اور کہتا ہے۔

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
کے ستم گر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

اس سے بالکل ہی مختلف ایک اور موقع دیکھئے۔ جناب عباس کو میدان کارزار میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن ان کی زوجہ رو رو کر برا حال کر رہی ہیں۔ اس وقت جناب عباس مناتے ہیں۔

تو پونچھ ڈالو آنسوؤں کو بہر والجلال
دیکھو زیادہ رونے سے ہو گا بھی ملال

اب ایک اور لفظ لیجئے۔ اللہ۔ ایک مصرع ہے۔ اللہ کا کرم تھا مدد پنجتن کی تھی۔

ایک اور مصرع ہے۔

"اللہ ری چمک علم بوتراب کی"

ایک اور مصرع سن لیجئے۔

"اللہ ہم کہاں سے کہاں لڑتے آئے ہیں"

تینوں جگہ پہ لفظ اللہ الگ الگ لہجوں اور الگ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک میں خدا ہے۔ دوسری میں خدا کی پناہ کا لہجہ ہے اور تیسرے میں خود اپنی ذات پر حیرت اور خوشی ہے۔

لیکن اس سے بھی کچھ زیادہ مشکل مقام آتے ہیں۔ مثال کے لئے ہم ایک مصرعہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ مصرع پیش کرنے سے پہلے وہ موقع بھی سن لیجئے جہاں یہ مصرع آیا ہے۔

امام حسینؑ کا مختصر سا قافلہ دریائے فرات کے کنارے پہنچتا ہے۔ فیصلہ ہوتا ہے کہ خیمے اس مقام پر نصب کئے جائیں۔ امام حسینؑ کے بے انتہا چہیتے بھائی جناب عباسؑ خیمے نصب کرا رہے ہیں کہ یزیدی فوج کا ایک رسالہ آکر انہیں خیمے نصب کرنے سے روکتا ہے۔ کیونکہ دریا کے کنارے یزیدی فوج خود پڑاؤ ڈالنا چاہتی ہے۔ جناب عباسؑ کو غصہ آجاتا ہے یہ شور سن کر عورتیں پریشان ہو جاتی ہیں۔ ان کی ملازمہ فضہ انہیں صرف اتنا ہی بتا پاتی ہے کہ جناب عباسؑ کو غصہ آگیا ہے۔

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے وہ غصہ ہے شیر کو

اب سنئے وہ مصرع جس کا میں نے ذکر کیا۔ غصے کی رپورٹ ادا ہو رہی ہے۔ کیونکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ جناب عباس کو غصہ کس بات پر آیا اور کیوں؟ بس اسے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ انہیں غصہ آگیا ہے۔ یہ رپورٹ سن کر جناب زینب کہتی ہیں۔

"ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال"

بہت سادا دا سا مصرعہ ہے۔ ظاہرہ ہے لہجہ نسوانی ہے۔ لیکن میں اگر مصرع کو بہ آواز بلند پڑھوں تو زور کس لفظ پر دوں؟ غضب پر یعنی اگر عباس کو غصہ آیا تو غضب ہو جائے گا یا جلال پر کہ اگر عباس کو جلال آگیا تو غضب ہو جائے گا؟

انیس نے جس طرح کردار تخلیق کیے ہیں ان کو نظر میں رکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مصرع میں زور نہ غضب پر ہے، نہ جلال پر بلکہ زور ہے انہیں پر۔ اب اس مصرع کو اس طرح پڑھ کر دیکھیے۔ 'ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال"

جلال تو سب ہی کو ہے۔ اکبر و قاسم، عون و محمد، سب ہی کو دشمن کی گستاخی اور بے دردی پر غصہ ہے لیکن عباس کی بات الگ ہے۔ اگر انہیں

جلال آگیا تو پھر کوئی روک نہیں سکتا۔ یعنی اس مصرع کی صحیح ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ میر انیس نے جناب عباس کا کردار جس طرح پیش کیا ہے وہ ہمارے ذہن میں ہو۔ بات سے بات نکلتی ہے تو یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ انیس نے جس محنت اور محبت کے ساتھ جناب عباس کی کردار نگاری کی ہے۔ اتنی محنت شاید جناب زینب کو چھوڑ کر اور کسی کردار پر نہیں کی۔ یہ دونوں ان کے محبوب ترین کردار ہیں۔ تو اس مصرع کا لہجہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انیس نے جناب عباس کا کردار جس طرح پیش کیا ہے۔ اسے ہم سمجھ لیں۔ عباس امام حسین کے مختلف العطن چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ امام حسین کو باپ کے برابر سمجھتے ہیں۔ بہت وجیہ، بہت حسین، بے انتہا جری، تلوار کے دھنی ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگر امام حسین کی شان میں کوئی ذرا سی بھی گستاخی کرنے کی جرات کرے تو یہ اس کی گردن اڑا دینے پر تیار۔ بہت جلد برافروختہ ہوتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو امام حسین کے سوا کوئی اس غصے کو ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔ بلکہ خود امام حسین کو ایسے وقت ان کو منانے اور غصہ ٹھنڈا کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اپنے سر کی قسم دینی پڑتی ہے۔ مصرع ہے "بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام" تب بھی ضروری نہیں کہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ صرف پاس ادب سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ کہ جب ان کو جلال آتا ہے تو کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ اب وہ مصرع پڑھیے۔

"ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال"

میں نے میوزیکل نوٹیشن کی جو مثال دی تھی یہ مقام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں مسئلہ یہ درپیش ہے کہ الفاظ کے ذریعے ایک ایسا مصرع تشکیل دیا جائے جو اپنے لہجے کے ذریعے اس کردار کی خصوصیات کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دے۔ انیس کا مشہور مرثیہ ہے۔ "خدا فارسِ میدان تہور تھا حر"۔ اس کا دوسرا مصرع ہے۔ "ایک دو لاکھ جوانوں میں بہادر تھا حر"۔ بہت سے لوگوں کو دوسرا مصرع اکثر پریشان کیا کرتا تھا۔ عام طور پر اچھے خاصے مرثیہ خواں اس مصرع کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ ایک حر دو لاکھ جوانوں پر بھاری تھا۔ دل کہتا تھا کہ اگر مصرع یوں ہے تو سست ہے۔ لیکن ایک دن مشکل حل ہو گئی۔ یعنی میری حد تک حل ہو گئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک جواں سال ریسرچ اسکالر نجف حیدر کو بھی یہ مصرعہ پریشان رکھتا تھا کیونکہ وہ بھی مرثیہ خوانی سے شوق رکھتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اس کا حل ڈھونڈھ نکالا۔ کہنے لگے چونکہ انیس کے یہاں لہجے کو اہمیت حاصل ہے اس لئے اس مصرع کو یوں پڑھ کر دیکھئے تو مفہوم واضح ہو جائے گا۔

مصرع۔ خدا فارس میدان تہور تھا حر
ایک دو؟ لاکھ جوانوں میں بہادر تھا حر

یعنی ایک دو کے بعد ہلکا سا سوالیہ نشان لگایئے جس میں استہزا کا ہلکا سا شائبہ بھی ہو اور اس کے بعد باقی کا مصرع پڑھئے سمجھ میں آجائے گا یعنی۔ ابھی ایک دو کس شمار قطار میں ہیں حر تو لاکھوں پہ بھاری تھا۔

میرے ایک بھائی ہیں زاہد نقوی وہ محرم میں ایک مرثیہ ضرور پڑھتے ہیں۔ ''جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا''۔ اپنے بزرگوں سے بار بار یہ مرثیہ سننے کے باوجود اس کے کچھ مصرعوں کی ادائگی انہیں بار بار کھٹکتی تھی۔ اس مرثیے کا ایک بند ہے۔

ظالم بچو بچو کے بڑھتے ایک بار سب
بادہ جو جو گیا سمت آئے سوار سب

نیزے علم لئے ہوئے تھے نیزے دار سب
باندھے تھے ایک غول خلالت شعار سب

لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھیں دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

آخری مصرع میں لفظ شور نے اچھے خاصے مرثیہ خوانوں کو غلط ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ یہ مصرع عام طور پر یوں ادا کیا جاتا تھا کہ دشمن کی فوج میں زبردست شور برپا ہے یعنی لفظ شور کو کھینچ کر اس لہجے میں ادا کیا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہو کہ یزیدی فوج میں شور و ہنگامہ برپا ہے۔ مگر ایک سال جب وہ

مرثیہ پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے تو اسے ایسے لہجے میں پڑھا کہ دشمن کی فوج کی کم ہمتی اور اس کی صفوں میں خلفشار کا منظر سامنے آگیا۔ اب مصرع یوں ادا کیا گیا کہ بس ایک بوکھلاہٹ کا شور سا تھا کہ ''چھین لو دریا کو شیر سے'' اور یہ مصرع ادا کرنے کے بعد منبر ہی پر سے بے اختیار بولے ''آج پڑھ لیا'' واقعی اس دن انہوں نے اس مصرع کو صحیح لہجے میں ہم سے متعارف کرایا۔

میر انیس نے مرثیہ کو خوبی گفتار اور انداز تکلم سے روشناس کرایا اور بجا طور پر فخر کیا کہ ''نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری'' اور یہ خوبی گفتار اپنا اعجاز خاص طور پر وہاں دکھاتی ہے۔ جہاں انیس مکالمہ تحریر کرتے ہیں۔ یہ مکالمے مختلف مرثیوں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ امام حسین اور یزیدی فوج کے لوگوں کے درمیان مکالمہ حر اور ابن سعد کا مکالمہ، جناب زینب اور عون و محمد کے درمیان مکالمے، امام حسین اور حضرت عباس کے درمیان گفتگو وغیرہ۔ طوالت کا خوف ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ان کی تفصیل میں جائیں۔ ہم صرف ایک موقع کی طرف اشارہ کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق ہمارے موضوع کے دوسرے حصے یعنی فن مرثیہ خوانی سے بھی ہے۔ یزیدی فوج امام حسین سے جنگ کر کے انہیں قتل کرنے پر آمادہ ہے۔

حسینی فوج میں غضب کا جوش و خروش ہے۔ نوجوان بے چین ہیں

کہ کس کس طرح دشمن کی صفوں پر جا کر ٹوٹ پڑیں۔

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگا طبل اس طرف
مشکل کشا کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف

تیروں نے رخ کیا سوئے ابن شہ نجف
سینوں کو نمازیوں نے ادھر کر دیا صرف

تھا اس کے شوق جنگ ہر اک رشک ماہ کو
جوش آ گیا وغا کا حسینی سپاہ کو

امام حسین اب بھی خاموش ہیں اور ان کی یہ خاموشی نوجوانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جناب عباس کا کردار جس طرح انیس نے پیش کیا ہے اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس لئے ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی دشمن کی سرکوبی کے لئے بے چین ہیں۔ دیکھئے کہ کس کس طرح امام حسین کو آمادہ کر رہے ہیں کہ جنگ کی اجازت دی جائے۔ ہر مصرعے کے لہجے پر غور کرتے جائیے۸۔ کسی ایک مصرع میں بھی اپنی طرف سے وہ جنگ شروع کرنے کی بات نہیں کرتے کیونکہ آخر فوج کے علم دار ہیں۔ ذمہ دار ہیں۔ کہیں امام حسین یہ نہ کہہ دیں کہ تم بھی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ لیکن ہر مصرع کا لہجہ خود بول رہا ہے کہ اس میں خود ان کی اپنی خواہش بھی شامل ہے۔ وہ صرف دوسروں ہی کی نہیں خود اپنے جذبات کی ترجمانی بھی کر

رہے ہیں۔

عباس شہہ سے کہتے تھے پھر آئے ہوئے ہیں شیر
تیر اس طرف سے آتے ہیں اب کس لئے ہے دیر

دو دن کی بھوک و پیاس میں ہیں زندگی سے سیر
مولا غلام سے ہیں رکھنے کی یہ دلیر

پاس ادب سے غیظ کو ٹالے ہوئے ہیں یہ
شیر خدا کی گود کے پالے ہوئے ہیں یہ

کس کو ہٹائے کس کو سنبھالے یہ جاں نثار
مرنے پہ ایک دل ہیں بہتر وفا شعار

ہے مصلحت کہ دیجئے اب اذن کارزار
ایسا نہ ہو کہ جا پڑیں لشکر پہ ایک بار

برہم ہیں سرکشی پہ سواران شام کی
اکبر کی بات مانتے ہیں نہ غلام کی

جب روکتا ہوں میں انہیں اے آسماں سر پر
کہتے ہیں کیوں امام کی جانب لگائے تیر

باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکر شریر

ہنگام جنگ شیر کے بچے ہوں گوشہ گیر

کس قہر کی نظر سے لعینوں کو تکتے ہیں
بچوں کو ہے یہ غیض کہ آنسو ٹپکتے ہیں

یہ ڈرامے کے اندر ڈرامہ ہے۔ عباسؑ کبھی خود اپنے لہجے میں بڑے بھائی سے مخاطب ہیں کبھی ان کے سامنے بچوں کی بات خود بچوں کے لہجے میں پہنچا رہے ہیں۔ یعنی ہمارے سامنے دو سے زیادہ کردار بہ یک وقت موجود ہیں۔ امام حسینؑ، عباسؑ اور بچے یا نوجوان۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تمام بندوں سے ظاہر ہے کہ خود عباسؑ بھی وہی چاہتے ہیں جو بچے چاہتے ہیں۔ یہاں لہجہ بدلتا رہتا ہے اور لہجے کی تبدیلی کے اظہار کے لئے تیور بدلتے رہتے ہیں۔ ہاتھوں کے اشارے بدلتے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک ایسی شخصیت کے سامنے ہو رہا ہے جس کا ادب اور احترام بولنے والے کے لئے اولین شرط ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ صرف ان بندوں کو بہ آواز بلند پڑھنے والا ہمارے سامنے ہے۔ یعنی اب اس کا انحصار مرثیہ خواں پر ہے کہ وہ ہمیں اس خیالی دنیا تک پہنچاتا ہے یا نہیں جو انیس نے تخلیق کی ہے۔

انیس کے زمانے تک آتے آتے سامعین اب صرف ثواب کمانے ، شہدائے کربلا پر آنسو بہانے ہی کے لئے مجلسوں میں شرکت نہیں کرتے

تھے۔ اب وہ اچھی شاعری اور اچھی خواندگی سننے کی خواہش اور امید کے ساتھ لے کر آتے تھے۔ انیس نے شاعری، ڈرانہ اور خواندگی پر محیط ایک جامع فن یعنی مرثیہ خوانی کے فن کی تخلیق کی اور اس طرح نہ صرف سننے والوں کی ان خواہشوں اور امیدوں کو پورا کیابلکہ ان میں ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو کامادہ بھی پیدا کیا۔

بھاؤاور بتانا۔

اس نئے فن مرثیہ خوانی میں لہجے کی ادائیگی کے لئے بہت سی شرطیں تھیں آواز کی خوبصورتی اور اسے دور کت لے جانے کی سکت، بات کہنے ک ڈھنگ، لفظوں کی صحیح ادائیگی یعنی انیس کے الفاظ میں ع '' یہ حسن صور تاور یہ قرات یہ شد و مد'' یا دوسرے لفظوں میں ع '' شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں'

لیکن لہجے کے بعد سب سے اہم عنصر تا بتانا۔ یعنی ب ھاؤ۔ سعادت خان ناصر اپنے تذکرے '' خوش معرکہ زیبا'' ۱۲۶۱ء / ۱۸۴۵ء انیس کے متعلق لکھتے ہیں ''' الحق مرثیہ ایسا کہا اور پھڑاکہ چرچادور دور ہوا۔ اور مرثیہ انکا عام فہم و عام پسند ہوا۔ الغرض مرثیہ پڑھنے اور بتانے میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ میر صاحب کے خاندان کا یہ طرز جدید ہے کہ شاگردان کا منبر پر جاکے بغیر تعلیم پائے ہوئے مرثیہ پڑھ نہیں سکتابلکہ شاگردان کادو

سال تعلیم پاتا ہے تب مرثیہ پڑھنے کے قابل ہوتا ہے"۔ یہ "بتانے" کا طریقہ میر انیس نے کہاں سے لیا؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟

پروفیسر منیر مسعود اپنی گرانقدر تصنیف "مرثیہ خوانی کا فن" میں کہتے ہیں "مرثیہ خوانی کے ابتدائی خدوخال اس فن سے پہلے دو روایتوں میں ملتے ہیں۔ ان میں ایک داستان گوئی کی روایت ہے اور دوسری شعر خوانی کی" (ص ۱۰) نیر مسعود صاحب نے خود اپنی اس کتاب میں بہت سے شواہد پیش کرنے کے باوجود ایک اہم ترین روایت کا ذکر نہیں کیا اور وہ ہے لکھنو کا ناچ۔ کتھک۔ کتھک صرف پیروں میں گھنگھروں باندھ کر ناچنے کا نام نہیں ہے۔ کتھک اس شخص کو کہتے تھے جو مختلف طریقوں سے کتھا سناتا تھا یا بتاتا تھا۔ ہندوستان کے تمام کلاسیکی ناچ کسی دیوی یا دیوتا کے متعلق کہانی دکھاتے یا بتاتے ہیں۔ یہ عبادت کا ایک طریقہ تھا اور آج بھی ہے۔

ہندوستان کے تمام اسٹیج کئے جانے والے فن جن میں کتھک بھی شامل ہے۔ بھرت کے ناٹیہ شاستر کے قائم کئے ہوئے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اس لئے ناٹیہ شاستر کو پانچویں وید کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ اس طرح مرثیہ خوانی کے فن کے بنیادی اصول ہمیں ناٹیہ شاستر میں ملتے ہیں جو کتھک کے ذریعے لکھنو اور میر انیس تک پہنچے۔

ہمارے موضوع سے متعلق ناٹیہ شاستر میں کیا ملتا ہے اور مرثیہ

خوانی کے فن نے اس سے کیا حاصل کیا اس کا بہت مختصر ساذکر ضروری ہے۔

''ناٹیہ شاستر بہت تفصیل سے بتاتا ہے کہ زبان کیسے بنتی ہے۔ آوازیں کس طرح نکالی جاتی ہیں اور معنی کی مختلف پرتوں کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف ترکیبیں اور لہجے کس طرح اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایکٹر کو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ اپنے سر، ہاتھ، کمر، سینہ، پیر، آنکھ، برو، ہونٹ، ٹھوڑی، وغیرہ سے اشاروں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایکٹر کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایک شخص کے علاقے یا سماجی رتبے کا بھی اس کی زبان اور اشاروں پر اسی طرح اثر پڑتا ہے جس طرح عمر اور جنس کا عام طور پر اثر پڑتا ہے۔

''ایک فرد اظہار کے لئے جو بھی طریقہ استعمال کرتا ہے وہ سب استعمال کرنے چاہیں۔ جیسے تکلم، اشارے، حرکت اور لہجے۔ تمثیل مختلف طرزوں میں ہو سکتی ہے جس کا انحصار اس پر ہوگا کہ طریقہ اظہار ایک ہے یا ایک سے زائد اور زور غلبہ کس طریقے کو حاصل ہے۔ بھرت اس سلسلے میں چار بڑی شکلوں کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ جس میں تکلم اور شاعری کو غلبہ حاصل ہو اور وہ جن میں رقص اور موسیقی کو غلبہ حاصل ہو''

(انڈین تھیٹر از آدیہ رنگاچاریہ ص،، نیشنل بک ٹرسٹ دہلی)

لکھنو میں واجد علی شاہ، بند ادین وغیرہ ناٹیہ استر کے اصولوں کے مطابق ٹھمک اور ٹھمری کو تک سکت سے درست کر دہے تھے "بقانا" ٹھمک اور ٹھمری کا اٹوٹ انگ تا اور ہے یہ وہی چیز ہے جسے بھاؤ یا ابھی نے" کہتے ہیں۔

شمھو مہاراج یا برجو مہاراج کو جن لوگوں نے بھی یا چھوٹی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہوگا وہ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 'بقانے' کا مطلب کیا دے۔ مثلاً برجو مہاراج بیٹھے ہیں اور بند ادین کی یہ ٹھمری گا رہے ہیں اور اسے بقا رہے ہیں۔

ہٹو چھیرو نہ کنہاذی   کاہے کو رار مچائی
بندا کہا نہیں مانت   دیکھو ساری چریاں کر کائی

وہ ناچ رہیہ ہیں۔ صرف بیٹھ کر ہاتھوں کے اشاروں، چہرے کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں اور بھوؤں سے مختلف کیفیتوں کے اظہار کے ذریعے ٹھمری کے بول بقا رہے ہیں۔ "ایک پھول کا مضمون سو رنگ سے باندھا جا رہا ہے۔ تب ہی تو انیس کہتے ہیں "ان (عربی فارسی شعروں) کے اشعار اندک غور سے کھل جاتے ہیں لیکن بھاشا میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب تک اس کے لفظوں کے ساتھ اشارات سے کام نہ لیں اس کا گہرا استعارہ کھل نہیں سکتا"

(فکر بلیغ بحوالہ مرثیہ خوانی افن ص ۷۵)

اب اگر ہم انیس کے اس قول سے یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ ٹھمک کے

بھاؤ یا بتانے ، کی طرف اشارہ کر رہے تھے تو شاید کچھ ناقدین میں اس دلیل کو پسند نہ کیا جائے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ نیر مسعود صاحب نے ہمیں اس کی تقریبا براہ راست شہادت بھی فراہم کردی ہے۔

چوہدری محمد علی کے ایک مضمون سے نیر صاحب نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس کا تعلق انیس کے بھائی اور شاگرد میر مونس سے ہے۔ میر مونس کے پڑوس میں ان کے ساتھ کا کھیلا ہوا ایک بھانڈ رہتا تھا۔ ایک دن اس نے تنہائی میں بڑی لجاجت کے ساتھ مونس سے کہا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ''کوری گگریا'' کس طرح بتاؤں مونس نے دروازہ بند کرایا اور ''بائیں ہاتھ کی پانچویں انگلیاں اوپر کیں جیسے پھول کی آدھی سے اک ذرا زیادہ کھلی ہوئی کلی ہوتی ہے۔ ہاتھ چہرے کے برابر اور سامنے لائے۔ داہنے ہاتھ سے ڈھیلی مٹھی باندھی اور بیچ کی انگلی سیدھی کر کے آدھی اس طرح ختم کی کہ بیچ کا پور دوسرے پوروں سے آگے نکلا رہا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بلندی پر خیالی گگریا کو ٹھنکا مار دیا'' (اینگا ص ۷۷ ، ۷۸) دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میر مونس نے کتھک کی چند مدراؤں کے ذریعے ''کوری گگری'' بتادی اور ہمیں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ شاگردوں کو منبر پر جانے سے قبل کس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسعود حسین رضوی ادیب آرزو صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں ''اور میر نفیس نے جب یہ بیت پڑھی

پریدہ طائر جاں یوں تھے خوف کھائے ہوئے
کہ جیسے شب کو اڑیں جانور ستائے ہوئے

تو ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی کہ خوف سے چڑیاں اڑتی دکھائی دینے لگیں۔۔ میر نفیس کا آخری زمانہ تھا سن شریف اسی سے تجاوز کر چکا تھا لیکن صبح کا منظر پیش کرتے ہوئے جب یہ مصرع پڑھا۔

نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حور سحر

"تو مرثیہ زانوں پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے نقاب الٹنے کا اشارہ کچھ اس طرح کیا کہ وہی بوڑھا چہرہ حور کی تصویر معلوم ہونے لگا" (ایضاً ص ۱۳)

انیس، مونس اور نفیس جیسے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں اگر کتھک اور کتھک کے بھاؤ واقفیت رکھتے تھے یا مہارت کی حد تک اس میں دخل رکھتے تھے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں اس وقت صاحب اثر اور مہذب لوگوں میں اعلیٰ تہذیب کے جو معیار تھے ان میں شعر فہمی، ممکن ہو تو شعر گوئی، موسیقی اور اس کی نزاکتوں سے واقفیت ضروری تھی۔ اودھ کے دربار میں ایک فن پروان چڑھ رہا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اشرف اس سے ناواقف ہوتے اور وہ بھی فنکار۔۔۔ غازی الدین حیدر کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔۔ "مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔ علم

موسیقی میں کمال بہم پہنچایا۔ اس طرح کا دھرپد، خیال، پٹہ گایا اور بتایا کہ کبھی کسی نائک کے وہم و گمان میں نہ آیا تھا۔

(فسانہ عجائب ص ۸ مطبع نول کشور لکھنو ۱۹۵۴)

جن لوگوں نے دولہا صاحب عروج کو دیکھا اور سنا ہے وہ بتاتے ہیں کہ وہ طبلہ بہت اچھا بجاتے تھے۔ خاص خاص طوائفیں تھیں جن کا مجرا انہیں پسند تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا تک ایسے علماء دین موجود تھے جو موسیقی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ مولانا سبط حسن بہت مشہور خطیب اور عالم دین تھے۔ میں نے لڑکپن میں مولانا کو ایک مجلس میں سنا تھا۔ ان کے متعلق آغا جانی کشمیری لکھتے ہیں ”مولانا سبط حسن نے موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ جو ان کے لڑکے سالک لکھنوی کے پاس موجود ہے۔ یہ کتاب انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوی ہے۔ (سحر ہونے تک صفحہ ۸۶)

بھاؤ وار بتانے کے متعلق ہماری اس تمام بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میر انیس یا دوسرے مرثیہ خوانوں نے کتھک سے یہ چیزیں مستعار لے کر انہیں اسی شکل میں استمال کرنا شروع کر دیا۔ ہم صرف اس حقیقت کی رفو اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ انیس نے ایک ایسے فن کی آبیاری کی جس کی جڑیں ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کے فنی اصولوں میں پیوست ہیں۔

قیاس یہی کہتا ہے کہ ان قدیم فنی اصولوں تک ان کی رسائی کھتمک، اور ٹھمری کے توسط سے ہوئی جو اس زمانے میں بام عروج پر تھیں۔

تو پھر میر انیس نے ہمیں کیا دیا؟ مولوی محمد حسین آزاد نے ایک ایرانی داستان گوئی کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے "اسے حقیقت میں بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیے کیونکہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے۔ (نحن دان فارس)

انیس نے بھی فرد واحد کا تھئیٹر قائم کیا۔ اسٹیج انہیں بنا بنایا مل گیا۔ مجلس عزا کا منبر، مسجد کا منبر نہیں تھا۔ لکڑی کا ایک بلند ڈھانچہ جس میں چند زینے ہیں۔ اگر مرثیہ حواں چوتھے زینے پر بیٹھا تو پیر تیسرے زینے پر ہیں۔ لیکن کبھی ایک پیر، کبھی دوسرا پیر دوسرے زنے پر آجاتا ہے۔ پشت کو سہارا دینے کے لئے اور دم لینے کے لئے پانچویں زینے کی پشت ہے۔ ہر اچھا فنکار جب بھی طویل مکالمے بولتا ہے یا اسے دیر تک اسٹیج پر رہ کر ایکٹنگ کرنی ہوتی ہے تو وہ اسی دوران دم لینے یا ستانے کا موع نکال لیتا ہے۔ یہ اسٹیج بہت محدود ہے۔ لیکن جو ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے اس کا تعلق مذہبی عقیدے سے ہے۔ جس میں تمام شرکاء اور مرثیہ خواں سو فیصد شریک ہیں اور یہ حد بندی انہوں نے خود قبول کی ہے۔ ان حدود کو نظر میں رکھتے ہوئے انیس نے ایک نیا فن ایجاد کیا۔ عربوں کا قول ان کے سامنے رہا ہو گا کہ معنی لفظ

کے نیچے یعنی تحت اللفظ میں ہوتے ہیں۔ اول تو موسیقی اس مذہبی ٹریجڈی کے لئے مناسب اور موزوں نہیں تھی۔ دوسرے موسیقی میں لفظ کی اہمیت کم سے کم تر ہوتی جاتیہ ے۔ یہاں تک کہ کلاسیکی موسیقی میں ختم ہی ہو جاتیہ ے۔ تحت خوانی کو میر ضمیر ایک حد تک فن کی شکل دے چکے تھے۔ اس طرز بیان کے امکانات نے انیس کو اپنی طرف کھینچا ہو گا۔ تحت لفظ کی ادائیگی کے لئے انہوں نے دو چیزوں کو چمکایا، نکھار اور استعمال کیا۔ لہجہ اور بھاؤ اور پھر انہیں بنیادی عناصر کو ذہن میں رکھ کر مرثیہ کہے۔ ایک بہت ہی محدود اسٹیج اور اسکے لوازمات اور عقائد کی عائد کی ہوئی حد بندیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے انیس نے اس چار دیواری کے اندر مرثیہ خوانی کے فن کو اظہار کی ایسی وسعتیں اور گہرائیاں بخش دیں جو صرف ایک غیر معمولی ذہن اور انتہائی حساس تخلیقی فنکار ہی سے ممکن تھا۔

ذرا سوچئے۔ انیس منبر پر بیٹھتے ہیں تو بیک وقت راوی بھی ہیں۔ (ناٹیہ شاستر کا سوتردھار)

امام حسین بھی، جناب زینب بھی، اور عون و محمد بھی، عباس بھی اور علی اصغر بھی، حد تو ہے کہ وہ حر بھی ہیں اور ابن سعد بھی، امام زین العابدین بھی ہیں اور یزید بھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک کلاسیکی رقاص بہ یک وقت کرشن بھی ہو جاتا ہے اور راکش بھی۔ ادھا بھی ہو جاتا ہے اور یشودھا بھی۔ لیکن دونوں میں

ایک بنیادی فرق ہے۔ رقاص کے سامنے ایک نسبتاً بڑا اسٹیج ہے۔ وہ پورے اسٹیج پر گردش کرتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا شخص گا رہا ہے اور رقاص صرف ان اشعار کو بتا رہا ہے۔ یا طبلے مردنگم کی تال کے ساتھ ناچ رہا ہے۔ مرثیہ خواں صرف ایک جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ خود شعر پڑھ رہا ہے۔ اور خود ہی انہیں بتا بھی رہا ہے۔ موسیقی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ صرف تحت لفظ میں زیر و بم کے ذریعے لہجے کے سہارے اپنی بات کہہ رہا ہے۔ وہ بتانے کے لئے بھاؤ کے کلاسیکی طریقوں کو اپنے مقصد کے لئے بدلتا ہے۔ نئے اشارے، نئی صدرائیں، نئے تیور ایجاد کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا فن ایجاد کرتا ہے جس کی جڑیں ہندوستان کی جمالیات میں پیوست ہیں۔ لیکن غالباً وہ قرات اور تجدید اور شعر خوانی سے کچھ اصولوں کا اکتساب کر کرے اس فن کو نیا رنگ، نیا آہنگ یا مجال عطا کرتا ہے۔ اردو زبان ایک نئے فن سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ بحث بیکار ہے کہ نیس پڑھتے وقت اگر ہاتھوں کو استعمال نہیں کرتے تھے تو دوسروں کو بھی ہاتھ کے اشاروں کو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ فن کی کاربن کاپی کو فن نہیں کہتے ہیں۔ تخلیقی امیج رکھنے والا ہر مرثیہ خواں اس فن پر اپنی انفرادیت کا ٹھپہ لگا دیتا ہے۔ میں نے دولہا صاحب کو تو نہیں سنا لیکن ان کے دو شاگردوں کو سننے کا بلکہ بار بار سننے کا موقع ملا ہے۔ ایک شاگرد رشید تھے سید رضی الدین صاحب (رئیس مصطفیٰ آباد) شاگرد رشید میں نے یوں کہا کہ دولہا صاحب ان کے قصبے یعنی (مصطفیٰ آباد) آکر مرثیہ پڑھتے بھی تھے اور

مرثیہ پڑھنا سکھاتے بھی تھے۔ وہ ان کو اتنے عزیز تھے کہ دولہا صاحب نے اپنے والد کا ایک مرثیہ انہیں تحفے کے طور پر دیا تھا۔ جس پر میر انیس کے ہاتھ کی اصلاح تھی۔ بعد میں یہ مرثیہ مہذب لکھنوی نے رضی الدین صاحب سے لے لیا اور اسے شائع کر دیا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے رضی صاحب کو بار بار پڑھتے سنا۔ زیادہ زور ان کا بھی آواز، لہجے اور تیور پر ہوتا تھا۔ لیکن جب بھی ہاتھوں کو استعمال کرتے تھے یا منبر پر آدھے کھڑے ہو جاتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بند واقعی ان حرکات کو مانگ رہا ہے۔ ایک مرثیہ جب دشمن کی فوج کی بھگدڑ کے بند پڑھ رہے تھے تو یہ مصرع آیا۔ "یوں فوج گھونگھٹ کبھی کھاتے نہیں دیکھا"۔ تو دونوں ہاتھوں کو ایک ساتھ لا کر کچھ ایسا خم پیدا کیا اور وہ خم ان کے داہنی طرف سے بائیں طرف کچھ اس طرح آیا کہ واقعی فوج کی بھگدڑ کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ تعریف کے جوش میں مجمع کھڑا ہو گیا اور رضی صاحب کو اس مصرع پر لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ منبر سے اتار لیا۔

دوسری چیز جو قابل غور تھی وہ یہ کہ دولہا صاحب نے انہیں جتنے مرثیے سکھائے تھے وہ سب کے سب میر انیس کے تھے۔ رضی صاحب نے ساری زندگی صرف میر انیس کے مرثیے پڑھے اور وہ بھی وہ مرثیے جو کہ ان کے استاد نے انہیں سکھائے تھے۔ یعنی دولہا صاحب عروج کو بھی بخوبی علم تھا

کہ صرف انیس کے مرثیے ہیں جو فنکارانہ طور پر پڑھنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ مشکل یہ آن پڑی کہ میر انیس کے بعد آنے والوں نے سمجھا کہ چونکہ انیس خود مرثیہ کہتے تھے اور خود ہی پڑھتے تھے اس لئے ہمیں بھی مرثیہ کہہ کر اپنا مرثیہ پڑھنا چاہیے۔ شکسپیر کے بعد انگریزی زبان میں کوئی اتنا بڑا شاعر ڈرامے کی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ کئی سو برس سے بڑے بڑے ڈائریکٹر اور فنکار شکسپیر ہی کے ڈراموں میں نئی نئی تعبیریں پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر انیس کے مرثیوں کی خواندگی کی بھی تعبیریں اسی طرح پیش کی جاتی رہیں تو شاید ہم اس بات کا ماتم نہ کرتے کہ مرثیہ خوانی کا فن ختم ہو گیا۔ مرثیہ انیس کے بعد بھی لکھے گئے اور آج بھی لکھے جارہے ہیں۔ ان میں سے چھ مرثیے اچھی نظمیں تو ہیں لیکن وہ مرثیہ خوانی کے [illegible]وے نہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مرثیہ خوانی کا فن بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بہار اور یو پی کے کئی قصبات میں اب بھی اچھے مرثیہ خواں مل جاتے ہیں۔ جو صرف انیس کو پڑھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر انیس کے کچھ مرثیوں کو ذوالفقار علی بخاری نے بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کئی برس پہلے راقم الحروف نے دہلی کے نیشنل اسکول آف ڈرامے کے ارباب حل و عقد کے سامنے تجویز پیش کی تھی کہ تحت اللفظ خوانی کو کورس میں رکھا جائے۔ لیکن بد قسمتی سے وہاں اس وقت ایسے لوگوں کا اقتدار تھا جو اردو کی طرف مائل نہیں تھے۔

اگر مرثیہ خوانی کے فن سے عملی طور پر وابستہ کچھ لوگ معتبر قسم کے تھیٹر کے لوگوں کے ساتھ ہی مل کر اور اردو اکاڈیموں وغیرہ سے مالی امداد لے کر اس فن کی تربیت کا بیڑہ اٹھائیں تو ممکن ہے کہ اس فن کے کچھ اور پہلو ہمارے سامنے آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح مرثیہ خوانی کے فن کے اصول اخذ اور مرتب کئے جا سکیں۔

مصنفہ کی دوسری کتابیں

- شاخ ہری اور پیلے پھول
- شاعر انقلاب (نظریاتی و تنقیدی مطالعہ)
- ردائے وفا
- رنگ سحر
- ادب سماجی شعور کے آئینہ
- "Contribution of Hazart Amir Khusro to the Music of the Subcontinent" (انگریزی)
- قائداعظم سے بھٹو تک (انگریزی)
- "ڈیماکریسی اور پاکستان" (انگریزی)
- Pakistani Politions